پردیسی درخت

نسیم حجازی

فہرست

پیش لفظ

"خاک اور خون" کی اشاعت کے بعد مجھے اُمید تھی کہ آنے والے اَدوار میں پاکستان کے کئی اہلِ قلم اِس موضوع پر لکھیں گے اور کاروانِ پاکستان نے ماضی کی تاریکیوں کے پہلو میں جو چراغ جلائے تھے ان کی روشنی قوم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی لیکن ہمارے ترقّی پسند دانش وروں کے نزدیک زمانۂ قبل از تاریخ کے کھنڈر مسلمانوں کی اُن جلی ہوئی بستیوں سے کہیں زیادہ اہم تھے جن کی راکھ ابھی تک گرم تھی۔

کوئی پچّیس برس قبل جبکہ "خاک اور خون" کے کئی ایڈیشن نکل چکے تھے، ایک گفتگو کے دَوران مَیں نے احسن صاحب کو یہ کہا تھا کہ اگر کبھی فرصت ملی تو میں "پردیسی درخت" کے عُنوان سے ایک ناول لکھوں گا۔ احسن صاحب ذرا چونکے لیکن اُن کے چھوٹے بھائی محمّد محسن صاحب کافی پریشان ہُوئے تھے ——

پانچ سال قبل میں افغانستان کے اولوالعزم مُجاہدوں کے مُتعلّق لکھنے کے لیے مواد جمع کر رہا تھا کہ اچانک بیمار ہو گیا۔ دو سال بعد مجھے ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا اور میرا تجزیہ یہ تھا کہ مُکمّل آرام کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ میں بستر پر لیٹے لیٹے کوئی ناول اِملا کرا دوں۔

کوئی تیس برس پہلے میں نے طویل علالت اور سخت تکلیف کی حالت میں "مُعظّم علی" اور "اور تلوار ٹوٹ گئی" اِملا کروائی تھیں لیکن اس وقت میرے

رفیقِ کار شرفُ الدّین اِصلاحی (اب ڈاکٹر شرفُ الدّین اِصلاحی) تھے۔

میں نے پروفیسر سعید اختر صاحب کو اِملا دینا شرُوع کی لیکن سخت گرمی کے ایّام میں ان کی صحّت پر اثر پڑا اور وہ زیادہ دیر میرا ساتھ نہ دے سکے۔ پھر کافی عرصہ تک کوئی نیا آدمی تسلّی بخش کام نہ کر سکا۔ ۱۹۸۶ء میں ایک ذہین بچّی آنسہ عارفہ عبّاس میرے کام میں شریک ہوگئی اور میرا خیال تھا کہ میں سال کے اِختتام تک یہ کام ختم کر لوں گا لیکن عارفہ عبّاس کے والد مُحترم ملازمت سے ریٹائر ہو چُکے تھے اور وہ کراچی شفٹ ہونے کی تیّاریاں کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ایک مہینہ کے لیے اپنا پروگرام مُلتوی کر دیا تاہم میری تمام کوششوں کے باوجُود ایک تہائی کِتاب باقی رہ گئی۔ ایک سال بعد آنسہ عارفہ کو یہ معلُوم ہُوا کہ کوئی اچھّا اِملاء لینے والا نہ ملنے کے باعث میرا کام رُکا ہُوا ہے تو وہ اپنے والد کے ساتھ راولپنڈی آگئی اور اپنی ایک عزیز سہیلی سیما رؤف کو اِملا لینے پر رضامند کر گئی۔ سیما بیٹی کے والد رؤف صاحب میرے پُرانے دوست نکلے اور اُنھوں نے خوشی سے بیٹی کو کام کرنے کی اجازت دے دی۔

آنسہ سیما رؤف کو اِملا دینے سے قبل سابقہ مسوّدے پر نظرِثانی کرتے ہُوئے مجھے یہ افسوس ہُوا کہ جو داستان "پردیسی درخت" کے عُنوان سے شرُوع ہُوئی تھی وہ اس قدر پھیل گئی ہے کہ اسے ایک ناول میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ایک وجہ تو اس کے موضُوع کا پھیلاؤ تھا اور دُوسری یہ کہ جب اِنسان کسی بیماری یا تکلیف میں مُبتلا ہوتا ہے تو وہ اپنے بچپن اور بھرپُور توانائی کے زمانے کی یادوں میں پناہ لیتا ہے۔ لہٰذا مَیں نے اِس ناول کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دُوسرا حصّہ "گمشدہ قافلے" کے عُنوان سے

اختتام پذیر ہوا۔

چنانچہ یہ کام جو مَیں نے تین سال قبل موسمِ گرما میں شروع کیا تھا، اِس سال گرمیوں کے اِختتام پر مکمل ہُوا۔ آخری اور سب سے زیادہ تکلیف دہ مرحلہ بے ترتیبی سے بکھرے ہُوئے مسودے کو یک جا کر کے اس کے صفحات کی ترتیب درُست کرنا تھا۔

"پردیسی درخت" اور اس کے بعد "گمشدہ قافلے" احسن صاحب کے سپرد کرتے ہُوئے مُجھے یہ محسُوس ہوتا تھا کہ یہ کام آنسہ سیما رؤف سے بہتر کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا جس کے لیے مَیں اِس ذہین اور محنتی بچّی کا شکر گزار ہُوں۔

مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ طویل علالت کے باعث میں یہ کام جلدی ختم نہ کرسکا اور مُجاہدینِ افغانستان کی ایمان افروز اور رُوح پرور داستان میں تین سال تاخیر سے شرُوع کر رہا ہُوں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ جو احباب مُجھ سے جہادِ افغانستان کے موضوع پر قلم اٹھانے کا تقاضا کرتے رہے ہیں، مَیں اُن کی توقعات پُوری کر سکوں ــــ آمین!

نسیم حجازی

"الغیاث" ۳۳/بی سیٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

یکم جنوری ۱۹۸۹ء

شیخ محمّد احسن

کے نام ــــ

جو

میرے دوست اور پبلشر بھی ہیں ــــ

آج سے تقریبًا پینتالیس برس قبل جب کوئی پبلشر ایک نئے مُصنّف کے مسوّدے کو ہاتھ لگانے کے لیے تیّار نہ تھا تو ایک دِن اچانک میں نے قومی کُتب خانہ میں اپنے کالج کے ایک ساتھی کو دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ قومی کُتب خانہ اِسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے گیٹ کے عین سامنے تھا اور احسن صاحب میرے کلاس فیلو تھے لیکن مُجھے معلُوم نہ تھا کہ یہ میاں مُحمّد نصیر ہُمایُوں صاحب کے بڑے بیٹے ہیں جن کے نام میں ایک تعارُفی خط لے کر حاضر ہُوا تھا۔ احسن صاحب کے ساتھ یہ اچانک مُلاقات میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ثابت ہُوئی اور چند ماہ بعد قومی کُتب خانہ سے میرا پہلا ناول شائع ہو گیا اور پھر تین اور تصانیف کے بعد میں فکرِ معاش سے آزاد ہو چُکا تھا ــــ

۴۵ سال بعد جب میں "پردیسی درخت" نصف سے زیادہ لکھ چُکا تھا تو ایک دِن مُجھے احسن صاحب کی صحت کے مُتعلق تشویش ناک خبر

ملی۔ بار بار فون کیا تو معلوم ہُوا کہ ریسیور اُتار کر رکھ دیا گیا ہے۔ ساری رات اضطراب میں گزری۔ کئی لوگوں کو فون کیے کہ اُن کے گھر جا کر پتہ کریں۔ صُبح آٹھ بجے معلوم ہُوا کہ اب وہ ٹھیک ہیں ـــــ میں نے کہا:

”اگر وہ ٹھیک ہیں تو اُنھیں یہ خبر پہنچا دو کہ میری نئی کتاب کا انتساب اُن کے نام ہو چکا ہے۔“

احسن صاحب مجھے دیکھ کر بہت خُوش ہُوا کرتے ہیں لیکن میرا پبلشر میرے ہاتھ میں کسی نئی کتاب کا مسودہ دیکھ کر اور بھی زیادہ خُوش ہوتا ہے ـــــ

کئی برس سے میری خواہش تھی کہ میں اُنھیں کوئی تحفہ پیش کروں، اُمید ہے کہ یہ کتاب جو میں نے بیشتر بیماری کی حالت میں لکھی ہے انھیں پسند آئے گی ـــــ

نسیم حجازی

۳۳-بی ”الغیاث“ سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

۱۹۸۹ء

پہلا حصّہ

برہنہ چٹانیں اور عظیم دریا

باب - ا

سکھر سے آگے جیکب آباد اور سبی کی جھلسا دینے والی گرمی سہنے کے بعد یوسف مچھ کے قریب ہوا کے خوشگوار جھونکوں سے اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ چند میل کا سفر اور طے کرنے کے بعد احمد خاں نے کار روکتے ہوئے کہا۔ "بھئی میں ذرا ٹانگیں سیدھی کر لوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔"

یوسف نے دروازہ کھول کر اُترتے ہوئے کہا: "خانصاحب میں بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا۔" چند قدم آہستہ آہستہ چلنے کے بعد وہ اچانک ٹیلے کی طرف بھاگنے لگا اور آن کی آن میں اس کی چوٹی پر جا پہنچا۔

یہ دراز قامت نوجوان جس کے دست و بازو تندرستی اور توانائی کا مظہر تھے اور جس کی آنکھوں سے جرأت ٹپکتی تھی، اُن خوش وضع لوگوں میں سے تھا، جن کے لڑکپن اور جوانی کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں تو دیکھنے والے ایک مُدّت تک عمر کے ان دو حصّوں کے درمیان فرق محسوس نہیں کرتے۔ اُس کے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ اور عزم و یقین کی روشنی تھی۔ گفتگو کے دوران جب وہ اچانک خاموش ہو جاتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اُفق سے آگے وہ کوئی اور چیز دیکھ رہا ہے۔

اُس کا ساتھی احمد خاں جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، بسندھ

کا ایک خوشحال زمیندار تھا لیکن تن آسانی کے باعث موٹاپے کی طرف مائل تھا۔

ڈرائیور اور نوکر جو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کار سے اُتر کر احمد خاں کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور وہ پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”دیکھا جسم کو بچپن سے [illegible] رکھنے میں کتنا فائدہ ہے۔ تم بھی تھوڑا بہت دوڑ لیا کرو۔“

ڈرائیور نے کہا ”سائیں میں اُسے آواز دوں؟ وہ کہیں اگلی پہاڑی کی طرف نہ بھاگ جائے“۔

”تمہاری آواز وہاں نہیں جائے گی، بہتر یہ ہوگا کہ تم بھاگ کر جاؤ اور اسے ساتھ لے کر آؤ“۔

”نہ سائیں میری توبہ، میں ایک ہرن کی طرح کیسے بھاگ سکوں گا“۔

یوسف اب پہاڑی سے نیچے اُتر رہا تھا، دوسرے نوکر نے کہا ”سائیں اسے اب آواز دینے کی ضرورت نہیں، وُہ خود ہی آ رہا ہے“۔

بیس منٹ بعد کار آگے روانہ ہو چکی تھی اور یوسف خوشگوار ہوا میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔



احمد خاں سے یوسف کی پہلی ملاقات صرف چار دن قبل سکھر میں اپنے ماموں زاد حسین احمد کے ہاں ہوئی تھی۔ حسین احمد وہاں اوورسیئر تھا اور یوسف اچانک ہی اُس کے گھر پہنچا تھا۔ حسین احمد اپنی ملازمت کے دوران کافی عرصہ پہلے بھی سکھر رہ چکا تھا اور وہاں سے چند میل دُور ایک گاؤں کے زمیندار سے اُس کے پرانے مراسم چلے آرہے تھے جس سے ملنے وہ گیا ہوا تھا۔

یوسف کو اپنے ماموں زاد کے گھر پہنچے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ کسی کی کار

دروازے پر آکر رُکی۔ حسین احمد کی بیوی نے ہارن سُن کر کہا: ”یوسف! یہ تمہارے بھائی جان کے دوست احمد خاں صاحب ہوں گے۔ انہیں بیٹھک میں بٹھاؤ اور کہو کہ وہ تھوڑی دیر تک آجائیں گے!!

اور وہ یہ بھی کہہ گئے تھے کہ آپ اسی وقت ان کے ساتھ کھانا کھائیں گے“

یوسف نے باہر نکل کر احمد خاں سے مصافحہ کیا اور کہا ”جناب! آپ کے دوست اس وقت گھر پر نہیں ہیں، وہ ابھی آجائیں گے۔ آپ تشریف رکھیے“۔

احمد خاں نے سر سے پاؤں تک غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ یقیناً یوسف صاحب ہوں گے۔ وہی قد و قامت، وہی لمبے لمبے بازو، بڑے بڑے ہاتھ اور وہی کشادہ سینہ جن کا احمد صاحب اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!“

ایک منٹ بعد احمد خاں اور یوسف بیٹھک میں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ یوسف اپنے گاؤں کے دلچسپ واقعات سُنا رہا تھا اور احمد خاں بے تحاشہ قہقہے لگا رہا تھا۔

کوئی بیس منٹ بعد حسین احمد بھی آپہنچا۔ احمد خاں کی کرسی بیٹھک کے سامنے تھی وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حسین احمد نے دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

”السلام علیکم!

سائیں شکر ہے۔ کہ آپ آگئے۔ میری بیس دن کی چھٹی منظور ہو گئی ہے انشاء اللہ میں کل ہی روانہ ہو جاؤں گا“۔

احمد خان نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: ”سائیں! شاید آپ کو اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑے گا“۔ حسین احمد کی نظر یوسف پر پڑی اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ حسین احمد نے شکایت کے لہجے میں کہا ”نالائق مجھے تار ہی دے دیا

ہوتا۔ مجھے بلاوجہ اپنے افسروں کی منتیں کرنا پڑیں۔ خانصاحب! مجھے اب واقعی سارا پروگرام بدلنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ چھٹی منسوخ کرانے کی بجائے یوسف کو کراچی کی سیر کرائی جائے۔"

"نہیں بھائی جان! کراچی میں ایک بار دیکھ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جولائی میں پہاڑوں کے سوا ہمارا اپنا علاقہ ہر جگہ سے زیادہ خوب صورت ہوتا ہے۔ میں صرف آپ کا اور بھابی کا گلہ دُور کرنے کے لیے آیا ہوں۔ سکھر بیراج کا کچھ حصہ میں دیکھ آیا ہوں، باقی شام کو دیکھ لوں گا۔"

احمد خان نے کہا "سائیں! میری تجویز ہے کہ آپ کو چھٹی بڑی مشکل سے ملی ہے اب اسے منسوخ نہ کرائیں! یوسف صاحب چند دنوں کے لیے کوئٹہ میں میرے مہمان ہوں گے۔ میں پرسوں وہاں جا رہا ہوں جب میں یہ دیکھوں گا کہ ان کا دل بھر چکا ہے تو میں انھیں گاڑی پر سوار کرا دوں گا، مجھے یقین ہے کہ زیارت کی سیر کرنے کے بعد آپ کا بھائی بہت خوش ہو گا۔"

حسین احمد نے کچھ سوچ کر کہا: "یوسف! تمھاری بھابی شاید اس بات پر خوش ہو گی کہ ہمارے ساتھ ہی واپس ہو گی، لیکن انھیں افسوس بھی ہو گا کہ تم اِتنی دُور سے آئے اور سیر بھی نہ کر سکے۔ ایک اچھے آدمی کی دعوت ٹھکرانا اچھی بات نہیں۔ تمھیں شکریہ کے ساتھ خانصاحب کی دعوت قبول لینی چاہیے، تعارف کے لیے یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میں انھیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔"

یوسف نے احمد خاں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "خانصاحب شکریہ لیکن میں ایک ہفتہ سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہروں گا۔"

تیسرے روز وہ حسین احمد اور اس کی بیوی کو گاڑی پر سوار کر کے احمد خاں کی رفاقت میں کوئٹے کا رُخ کر رہا تھا۔

کوئٹے تک باقی راستے میں یوسف کے لیے خوشگوار ہوا کے سوا دلچسپی کی اور کوئی بات نہ تھی۔ اُس نے چلتن اور کوہِ مردار کے مناظر دیکھتے ہوئے کہا: "خانصاحب! یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ پہاڑ اس قدر برہنہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں سبزہ زاروں، جنگلوں، آبشاروں اور برفانی چوٹیوں کے سوا پہاڑوں کے متعلق کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

احمد خان نے جواب دیا: "بھئی ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف تو سردیوں میں نظر آتی ہے۔ وہ برہنہ پہاڑ جو کوئٹے سے بالکل قریب ہے اُسے کوہِ مردار کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک یا دو دن کوئٹے میں آرام کرنے کے بعد ہم زیارت جائیں گے۔ وہاں پہاڑوں پر ماجو کے درخت دیکھ کر آپ کو بہت خوشی ہو گی۔ اگر بارش ہو گی تو کسی جگہ آبشار بھی نظر آ جائے گی۔"



بلوچستان میں یوسف کے قیام کے آٹھ دن ایک دل کش خواب کی طرح گذر گئے۔ اُس نے تین دن زیارت میں قیام کیا تھا۔ ایک دن گرد و نواح کے سرسبز پہاڑوں کی سیر کی تھی۔ اگلے دن ایک مقامی سکول ماسٹر کی رفاقت میں خلیفت کی چوٹی سے ہو آیا تھا اور جو لوگ بلوچستان کے بلند ترین پہاڑ کو دیکھ چکے تھے وہ اِسے ایک کارنامہ سمجھتے تھے۔

اب آٹھ دن بعد اس نے احمد خاں سے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا: "یار! کل پھر دیکھا جائے گا۔"



عصر کی نماز کے بعد یوسف سیر کے لیے نکلا اور تھوڑی دیر بعد احمد خاں بھی اپنی کار پر کسی دوست سے ملنے کے لیے چلا گیا۔

رات کے وقت احمد خاں واپس آیا اور اُس نے کار سے اُترتے ہی نوکر سے پوچھا۔ "مہمان آگیا ہے"؟ "جی نہیں"! نوکر نے جواب دیا: "کافی دیر ہوگئی ہے۔ اگر حکم ہو تو آپ کا کھانا لگوا دیا جائے"۔

"نہیں ہم اس کا انتظار کریں گے تم ڈرائیور کو کھانا کھلا دو۔"

تھوڑی دیر بعد احمد خاں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "سائیں۔ مہمان آگیا ہے"۔ احمد خاں نے کہا: "اُسے یہیں بُلا لو اور کھانا بھی لے آؤ۔"

نوکر "اچھا سائیں" کہہ کر واپس چلا گیا۔ اور ایک منٹ بعد یوسف کمرے میں داخل ہُوا۔

احمد خاں نے اُٹھ کر اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"سائیں آج آپ نے بہت پریشان کیا۔"

"جناب! بات یہ ہوئی تھی کہ مجھے قندھاری بازار میں اسلامیہ کالج لاہور کے چند طلباء مل گئے تھے۔ اُن میں سے ایک تو کوئٹہ کا ہی باشندہ ہے۔ دو کو مَیں پہچانتا تھا۔ باقی میرے لیے اجنبی تھے اور ملتان سے کوئٹہ کی سیر و سیاحت کے لیے آئے تھے۔ وہ تھوڑی سی مُدّت میں بلوچستان کے زیادہ سے زیادہ علاقے کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا کل کا پروگرام یہ تھا۔ "کہ کوہ مردار کی چوٹی سر کی جائے"! مجھے ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کو بھی پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ نہیں۔ مَیں کانگڑہ کے پہاڑوں پر چودہ ہزار فٹ کی بلندی تک جا چکا تھا۔ لیکن کوہِ مردار میرے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ مَیں نے انھیں سمجھایا کہ اگر تم واقعی اس پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہو تو تمہاری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ تم پچھلے پہر تک اس پہاڑ کے دامن میں کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤ، جہاں سے اُوپر جانے کا راستہ تلاش کرنا آسان ہو اور طلوعِ آفتاب

کے ساتھ ہی تمھیں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بعد گرمی میں پہاڑ پر چڑھنا تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ پیاس بہت لگے گی۔ اس لیے ہر ایک کے پاس اپنی چھاگل ہونی چاہیے۔ میرے مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجھے راہنما بنا کر ساتھ لے جانے پر مُصر ہو گئے اور میں کوشش کے باوجود اُن سے جان نہ چھڑا سکا۔

پروگرام یہ بنا کہ ہم ابھی کسی مقامی راہنما کو ساتھ لے کر شہر سے باہر وہ مقام دیکھ آئیں جہاں پر ہمیں کل علی الصبح جمع ہونا ہے۔ نماز فجر پہلی چڑھائی ختم کرنے کے بعد ادا کریں گے۔ اس لیے سب یہاں سے وضو کر کے روانہ ہوں گے۔ اگر کسی کو دیر ہو جائے تو اُسے ہمارے پیچھے پیچھے آنا پڑے گا۔ میرا یہ مطلب ہے کہ اس کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے میری یہ باتیں مان لیں، لیکن ——

پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر ہمیں اوپر کا راستہ دیکھنے کے لیے کافی دُور جانا پڑا! اِس لیے مجھے یہاں آنے میں دیر ہوگئی جس کے لیے مَیں معذرت خواہ ہوں۔"

اِتنی دیر میں نوکر نے کھانا لا کر تپائی پر رکھ دیا اور احمد خاں دیر تک یوسف سے بلوچستان کے مختلف پہاڑوں کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یار! یہاں سے چلتن بھی بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ چلتن کے اندر بہت ٹھنڈے، میٹھے چشمے اور بہت بڑے بڑے غار بھی ہیں۔ جن میں اِتنے بڑے بڑے اژدہے ہوتے ہیں کہ انسانوں تک کو نگل جاتے ہیں۔"

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا۔

"خانصاحب! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چلتن جیسا خشک پہاڑ کسی کو بھوک اور پیاس کے سوا کیا دے سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ درندہ جو دوسروں

کے گوشت پر پلتا ہے ہمیشہ ایسا مسکن تلاش کرتا ہے جہاں قدم قدم پر شکار مل
سکے اور شکار وہاں ہوتا ہے جہاں پانی اور سبزہ ہو۔

"آپ نے کبھی اژدہا دیکھا ہے ؟"

"جی ہاں : کانگڑہ میں ! ایک سرسبز پہاڑ خچروں کی گذرگاہ تھی، میں بلندی
کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک مَیں نے کوئی آہٹ محسوس کی۔ سامنے دیکھا تو ایک
موٹا تازہ سانپ پگڈنڈی کے بائیں ہاتھ کی جھاڑیوں سے نکل کر دائیں طرف کی
جھاڑیوں میں غائب ہو رہا تھا۔ مَیں نے اُس کا سر نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
وہ کسی شکار کے پیچھے جا رہا ہے۔

جتنا وقت اُس نے میری آنکھوں سے اُوجھل ہونے میں لگایا تھا۔ اگر اس
کے پیشِ نظر میں اُس کی جسامت کا اندازہ کروں تو اس کی لمبائی پہاڑی راستے کی
چوڑائی سے تین گنا زیادہ ہوگی۔ یعنی کوئی اٹھارہ بیس فٹ !

"——— اور اُس کی تیز رفتاری کی وجہ بھی تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ کسی شکار
کے پیچھے لگا ہوا تھا، جسے مَیں نے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا
کہ اِتنا بڑا اژدہا مجھ سے ڈر کر بھاگ جائے گا۔"

احمد خاں نے کہا۔"یار ! مَیں چڑھائی سے گھبراتا ہوں لیکن کانگڑہ کے متعلق
تمہاری باتیں سُن کر مجھے یہ خیال آنے لگا ہے کہ اگر کبھی تمہاری رفاقت میں سفر کا موقع
ملا تو میں تمہارا ساتھ دُوں گا۔

اب آپ کے صبح کے پروگرام کے متعلق میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ پورے
اطمینان سے ناشتہ کر کے جائیں میرا ڈرائیور آپ کو اُس مقام تک لے جائے گا
جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے۔

ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح تک میرا موڈ بھی بن جائے اور میں کچھ دُور تک

آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤں۔"

یوسف نے کہا۔"خاں صاحب ! یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ اس
صورت میں میری یہ کوشش ہوگی کہ آپ کم از کم پہلی چڑھائی تک میرے ساتھ چلیں۔
اور ہم دوسروں کا انتظار کرنے کی بجائے جلد از جلد روانہ ہو جائیں تاکہ پہلی چوٹی
پر نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد آپ صبح کے دلکش مناظر دیکھ سکیں اور پھر اگر آپ
یہ محسوس کریں کہ آپ تھک گئے ہیں تو آپ وہیں آرام کریں اور مَیں بہت جلد
بلند چوٹی کے اُوپر سے ہو آؤں گا۔ ایسی صورت میں مجھے اس بات کی پرواہ نہ ہوگی
کہ میرے ساتھی آتے ہیں یا نہیں ؟"

احمد خاں نے کہا۔"میرے دل میں آپ کے ساتھ جانے کا خیال ہی اس
لیے پیدا ہوا ہے کہ آپ کے ساتھی شاید نہ آئیں اور ہم تھوڑی سی تھکاوٹ
کے بعد واپس آجائیں گے ! سچ تو یہ ہے کہ مجھے کوہِ مردار کا نام ہی اچھا نہیں لگتا
اور ایک دوست کو تنہا اس طرف بھیجتے ہوئے مجھے ایک اَن جانا سا خوف
محسوس ہوتا ہے اور اگر صبح تک تمہارے ساتھ جانے کا ارادہ پختہ کر لوں تو اس کا
مقصد اپنی بہادری اور مستعدی کا ثبوت دینا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی وجہ محض یہی ہوگی
کہ مجھے تمہاری رفاقت پسند ہے۔"

باورچی برتن اُٹھانے آیا تو احمد خان نے کہا۔

"دیکھو ! ناشتہ صبح ۴ بجے سے پہلے تیار کرنا ہے۔ مہمان کے ساتھ میرا بھی !
——— یہ اور بات ہے کہ میں بستر سے اُٹھتا یا ناشتہ کرنا پسند نہ کروں لیکن تم مجھے
جگا ضرور دینا۔ گل محمد چوکیدار اور ڈرائیور کو بھی تین بجے تک ناشتہ دے دینا۔ اگر میں
نہ بھی گیا تو بھی گل محمد جو اس علاقے سے واقف ہے یوسف صاحب کا ساتھ دے گا۔
اسے ابھی کہہ دو کہ تیار رہے۔ میری ایک دونالی بندوق دُوربین اور کارتوسوں کی پیٹی

بھی اس کے سپرد کردو۔ اور صبح مجھے اپنا ریوالور اٹھانا بھی یاد دلا دینا۔

احمد خاں ایک تنگ راستے پر گل محمد اور یوسف کے پیچھے پیچھے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہُوا، پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ پر ایک خوفناک کھڈ تھا جس کی چوڑائی اُوپر کی طرف بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی اور گہرائی اُسی نسبت سے بھیانک نظر آتی تھی۔ احمد خاں اس بات سے بہت پریشان تھا کہ راستہ بار بار کنارے کو چھُوتا تھا۔ اُسے قدم قدم پر یہ احساس ہوتا تھا کہ کسی جگہ اُس کا پاؤں پھسل جائے گا اور وہ کئی گز نیچے لڑھکتا چلا جائے گا۔

مشرق کی سمت آسمان پر روشنی بتدریج پھیل رہی تھی۔ ہوا بڑی خوشگوار تھی اس کے باوجود اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ گل محمد جس نے بندوق اٹھا رکھی تھی گٹھے ہوئے جسم کا ایک تندرست آدمی تھا۔ وہ اپنی چال سے پہاڑ پر چڑھنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

احمد خاں نے اپنے گلے سے پستول کی پیٹی اتار دی اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

"بھئی! اسے بھی پاس رکھو اور یہ میری ٹوپی بھی لے لو۔ شکر ہے کہ مَیں نے یوسف کو دیکھ کر کوٹ نہیں پہنا تھا۔

جب ان کا راستہ کھڈ سے دُور ہٹ گیا تو یوسف اچانک تیزی سے آگے نکل گیا اور ایک موڑ پر رُک کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

احمد خاں نے شکایت کی۔ "دیکھو یار! مَیں آپ کے ساتھ اِس لیے آیا ہوں کہ ہم سیر بھی کریں گے اور باتیں بھی کریں گے۔

یوسف نے جواب دیا: "خان صاحب! مَیں یہ محسوس کرتا تھا کہ باتیں کرنے سے آپ کا سانس جلدی پھول جائے گا۔ اب ہماری پہلی منزل قریب آ رہی ہے اُس کی چوٹی پر پہنچ کر ہم پہلے نماز پڑھیں گے اور پھر خوب باتیں کریں گے"۔

احمد خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کاش! یہ راستہ ایسا ہوتا کہ میں آنکھیں بند کر کے بھاگ سکتا اور ایک ہی دوڑ میں چوٹی پر پہنچ جاتا۔ لیکن یہاں تو اس خوف سے بھی بات نہیں کرتا۔ کہ ایک ذراسی غفلت یا بے توجہی سے میں موت کے منہ میں جا سکتا ہوں۔ یار! سچ کہو۔ تمہیں خوف نہیں آتا، اِن راستوں سے"؟

یوسف نے جواب دیا۔ "خان صاحب دو چار بار چلنے کے بعد آپ کو بھی خوف نہیں آئے گا"۔

وُہ چند منٹ خاموشی سے چلتے رہے، پھر ایک جگہ پہنچ کر یوسف نے احمد خان کا بازو پکڑ لیا:

"خان صاحب! اب تیزی سے دس قدم اٹھائیں اور پھر تین اطراف نظر دوڑائیں تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ کے سفر کی پہلی منزل آپ کے قدموں میں ہے"۔

ایک۔ دو۔ تین ——— بلند آواز میں دس تک گن کر اُس نے اللہ اکبر کہا اور خان صاحب سبحان اللہ۔ سبحان اللہ کہتے ہوئے ان پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگے جو تین اطراف سے کوئٹہ کی وادی کو گھیرے ہوئے تھے۔

یار واللہ! وہ بولے: میرا یہاں تک پہنچنا ایک معجزہ ہے۔ اب اگر وقت باقی ہے تو ہمیں نماز پڑھ لینی چاہیے اور تم امامت کے فرائض انجام دو گے"۔

یوسف نے ایک طرف ہٹ کر نسبتاً ہموار جگہ پر اذان دی اور دونوں قبلہ رُو کھڑے ہو گئے۔

یوسف نے نماز پڑھانے سے پہلے نوکر کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ نوکر آگے بڑھنے کی بجائے جلدی سے ایک پتھر کی اوٹ میں چھُپ گیا۔ دونوں نے

نماز ادا کی۔ احمد دعا کے بعد وہیں لیٹ گیا: "یار! بڑا مزہ آیا، مجھے نیند آ رہی ہے۔ اگر تمہیں اُوپر جانا ہے تو جلدی سے ہو آؤ۔ مَیں تو ایک قدم بھی آگے نہیں جاؤں گا۔ اور دیکھو! نوکر سے میری بندوق لے لو۔"

یوسف نے کہا۔ "خان صاحب! یہ تو آپ کو تجربہ ہو گیا کہ چڑھائی پر ایک پاؤ وزن بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ بندوق اُٹھا کر تو مَیں بالکل آگے نہیں جا سکوں گا۔"

"اچھا تو یوں کرو کہ نوکر سے میرا پستول ہی لے لو۔ پیٹی گلے میں ڈالنے سے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

یوسف نے کہا۔ "اگر ضرورت ہوتی تو میں یہ دونوں چیزیں ساتھ لے جاتا لیکن وہاں اِن کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟"

"احمد خان نے کہا۔ "دیکھو! بھئی میں کچھ وہمی سا آدمی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مَیں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا تھا۔ دراصل یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہیں آتا۔ اِس لیے تمہیں ہتھیار کے بغیر یہاں بالکل نہیں جانا چاہیے۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خان صاحب! جب میں خطرہ دیکھوں گا تو مَیں سیدھا آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!"

یوسف چوٹی کا تقریباً دو تہائی فاصلہ طے کر چکا تھا اور وہ کھڈ جو پہاڑ کے قدموں میں نصف میل سے زیادہ چوڑا تھا اب کم ہو کر تقریباً سو گز چوڑا رہ گیا تھا۔

وہ تازہ دم ہونے کے لیے رُکا۔ اچانک اُس کی نظر دوسرے کنارے پر دو بھورے رنگ کے جانوروں پر جا پڑی۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ وہ السیشن

کُتے ہیں اور اطمینان سے اپنے مالک کے پیچھے جا رہے ہیں۔ لیکن چند قدم اُٹھانے کے بعد اُس نے دیکھا کہ وہ دونوں جانور اسی رفتار سے اُوپر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے آس پاس کوئی آدمی نہ پا کر یوسف کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ پہاڑی بھیڑیئے ہیں وہ تیزی سے کنارے کی طرف بڑھا۔ اُس نے کھڈ کی گہرائی کا جائزہ لیا۔ ایک پتھر اُٹھایا اور نیچے اترنے لگا۔ بھیڑیئے اس عرصے میں ایک جگہ کھڑے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُس نے چلتے چلتے دو مرتبہ مڑ کر دیکھا تو وہ اُسی جگہ کھڑے تھے۔ اُسے اطمینان تھا کہ کھڈ عبور کر کے بھیڑیئے اگر حملہ کر بھی دیں تو وہ پتھر گرا کر انہیں ہلاک کر سکتا ہے۔ یہ چٹانیں ایسی تھیں کہ ایک بھاری پتھر نیچے لڑھکا دینے سے راستے کے کئی چھوٹے چھوٹے پتھر اپنے ساتھ لے جا سکتی تھیں۔ بھیڑیوں کے حملے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ پہلے بھاگتے ہوتے بلندی کی طرف جاتے پھر اُس جگہ پہنچ کر اس طرف اُترتے جہاں کھڈ کے کنارے آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن ایسی صورت میں وہ ان سے کافی دور جا سکتا تھا۔

یہ سوچتے ہی وہ اپنی عام رفتار سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے دوبارہ مڑ کر دیکھا تو بھیڑیے اُسی جگہ دکھائی دیے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ شاید بھیڑیوں کا کوئی اور گروہ کسی دوسری جگہ اُس کی گھات میں بیٹھا ہوا ہو۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر لی اور جب وہ پہلی منزل کے قریب پہنچا تو احمد خان نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"آپ چوٹی سے ہو آئے ہیں؟"

"جی نہیں! مَیں دو بھیڑیوں سے جان بچا کر واپس آ گیا ہوں اور میں اس بات پر پچھتا رہا ہوں کہ میں نے آپ کی چھٹی حس کا احترام کیوں نہ کیا؟"

"بھیڑیئے تم نے کہاں دیکھے تھے؟"

"خانصاحب، کھڈ کے دوسرے کنارے وہ میرے ساتھ ساتھ اوپر جا رہے تھے
اور چوٹی سے نیچے ایک جگہ جہاں کھڈ کے دونوں کنارے آپس میں ملتے دکھائی دیتے ہیں'
وہاں ہماری ملاقات ہونے والی تھی۔"

احمد خاں نے کہا۔"واللہ! اگر میری ٹانگوں میں جان ہوتی تو میں اسی وقت
آپ کے ساتھ چل پڑتا۔ پھر آپ میرا نشانہ دیکھتے۔ میں نے بندوق اٹھانے کا ارادہ
کرتے وقت سوچا تھا کہ شاید کوئی شکار مل جائے لیکن یہ خیال دل میں نہیں آیا تھا کہ
شکار بھیڑیئے بھی ہو سکتے ہیں! بہرحال اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ
نیچے اترنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

یوسف احمد خان کے ساتھ چل دیا مگر تھوڑی دُور جا کر وہ اچانک چلّایا:
"خان صاحب! غضب خدا کا! اِدھر دیکھیے؟"
"کیا ہُوا؟" احمد خان نے بدحواس ہو کر پوچھا۔
یوسف نے کھڈ کے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"خان صاحب۔ اِس دنیا میں بے وقوف صرف مَیں ہی نہیں ہوں۔ میری طرح کے
اور لوگ بھی اس جہان میں بستے ہیں۔
۔ وہ دیکھیے! اُدھر سے کوئی احمق سیدھا اُسی طرف جا رہا ہے جہاں مَیں
نے ابھی ابھی بھیڑیئے دیکھے تھے۔
وہ فوجی بوٹ پہنے ہوئے ہے۔ چھاگل گلے میں ڈال رکھی ہے۔ سر پر ہیٹ
ہے۔ ہاتھ میں چھڑی بھی ہے۔ اگر بھیڑیئے کہیں دُور نہیں چلے گئے تو وہ بیوقوف
سیدھا موت کے منہ میں جا رہا ہے۔"

یوسف ہاتھ بلند کرتے ہوئے پوری قوت سے چلّایا:
"ٹھہر جاؤ! رُک جاؤ! آگے مت جاؤ!"

وُہ ایک لمحہ رُکا اور پھر احمقوں کی طرح آگے چل دیا۔
یوسف نے کھڈ کا جائزہ لینے کے بعد گل محمد سے بندوق پکڑتے ہوئے کہا:
"خانصاحب اگر مَیں اُوپر جا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر سکوں تو اُس کی جان بچ
سکتی ہے۔"
یوسف یہ کہہ کر اُوپر چڑھنے لگا۔
احمد خان نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔"بھئی میں تمہارے ساتھ ہوں"۔
گل محمد بھی اُس کے ساتھ تھا اور کھڈ کی دوسری جانب مڑ کر پوری قوت سے
آوازیں دے رہا تھا۔"رک جاؤ! بھائی رک جاؤ آگے خطرہ ہے۔"
کوئی دس منٹ چلنے کے بعد احمد خان نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا، گل محمد نے مڑ کر
کہا۔"سائیں وُہ نظر نہیں آتا۔"
"کون یوسف؟" احمد خان نے دوربین آنکھوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں سائیں، وہ بیوقوف نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ہم سب اس مصیبت
میں پھنس گئے ہیں۔"

احمد خان چند منٹ اوپر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لیٹتے ہوئے کہا۔
"گل محمد اب تم دُوربین پکڑ لو اور ان کی طرف دیکھتے رہو۔"
گل محمد نے دوربین پکڑ لی اور احمد خان نے آنکھیں بند کر لیں، چند منٹ بعد
گل محمد چلّایا۔"سائیں، یوسف بھی کہیں غائب ہو گیا ہے۔"
احمد خان ہڑبڑا کر اُٹھا۔"کہیں گر تو نہیں پڑا وُہ؟"
"سائیں وہ بائیں طرف مڑا تھا شاید اُس طرف کسی کھڈ میں اُتر گیا ہو جو
یہاں سے نظر نہیں آتی۔"
احمد خاں کچھ دیر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر دور سے یکے بعد دیگرے

بندوق کے دو فائر سنائی دیے تو وہ خوشی سے چلایا "گل محمد تم نے فائر سُنے ہیں"
"جی دو فائر ہوئے ہیں۔ لیکن نظر کوئی نہیں آتا"
"یہ فائر یوسف کے سوا کون کرسکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وُہ زندہ ہے اور شاید وہ بیوقوف بھی زندہ ہو — اس وقت ہم دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے"۔
احمد خان پھر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں اور تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔

———○———

گل محمد دُوربین اُٹھائے بیس منٹ اوپر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک چلایا "سائیں وہ آرہا ہے۔ وہ دونوں آرہے ہیں۔ سائیں مبارک ہو"
احمد خان نے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
گل محمد نے اسے دُوربین پیش کرتے ہوئے کہا۔ "سائیں دُوربین سے دیکھئے وہ صاف نظر آرہا ہے۔ سائیں مَیں درست کہتا تھا۔ وہ کسی دوسرے کھڈ سے نمودار ہوئے ہیں جو نظر نہیں آتا۔ احمد خان نے دوبارہ لیٹتے ہوئے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ اللہ کا شکر ہے تم دوربین اپنے پاس رکھو اور میری باتوں کا جواب دیتے رہو۔ وہ آرام سے آرہے ہیں یا بھاگتے ہوئے آرہے ہیں؟" "سائیں اوہ بہت آرام سے آرہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ باتیں بھی کررہے ہیں"۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھیڑیئے ان کا پیچھا نہیں کررہے"۔ "بالکل نہیں سائیں"۔
"اچھا گل محمد اب تم شور نہ کرو اور مجھے سونے دو"۔
"سائیں میرا خیال ہے کہ اگر آپ آہستہ آہستہ پہاڑ سے اترنا شروع کردیں تو بہتر ہوگا، اتنی تھکاوٹ کے بعد یہاں سونے سے آپ کا جسم اکڑ جائے گا۔"

احمد خان نے اطمینان سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا "یار اکڑ جانے دو جسم کو"
اور چند منٹ بعد وہ خرّاٹے لے رہا تھا۔

———○———

"خان صاحب! خانصاحب!!"
احمد خاں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ یوسف اس کا بازو ہلا رہا تھا۔ اور ایک اجنبی اس کے ساتھ کھڑا تھا! گل محمد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس سے کہا:
"السلام علیکم! جناب! آپ نے ہمیں بہت پریشان کیا"۔
اجنبی نے جھک کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "وعلیکم السلام! مجھے اپنی حماقت کا احساس ہے کہ آپ لوگوں کو تکلیف ضرور ہوئی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے کہ آپ اس طرح آگئے جیسے کسی کی جان بچانے کے لیے فرشتے پہنچ جائیں۔ مَیں آپ کا احسان مند ہوں"
احمد خان نے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "سائیں! فرشتہ یہ ہے جسے آپ نے مجھ سے زیادہ خوار کیا ہے، لیکن آپ اس پہاڑ پر کیسے پہنچے؟"
اجنبی نے جواب دیا۔
"جناب! مَیں اس کے لئے حماقت کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ دراصل مجھے پہاڑوں پر چڑھنے کا خبط ہے اور مَیں سمجھتا تھا کہ یہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا"
احمد خان نے پوچھا: "آپ یہاں پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے آئے ہیں؟"

"نہیں جناب ! مَیں فوج میں ملازم ہوں ۔ میری تبدیلی یہاں ہوئی ہے ۔ میں صرف پندرہ دن پہلے آیا ہوں اور ایم ای ایس کا ایس ڈی او میرا رشتہ دار ہے ۔ اِس لیے عارضی طور پر مَیں اُن کے پاس ٹھہر گیا ہُوں ۔"

احمد خان یوسف کی طرف متوجہ ہوا ۔

"بھائی مجھے یقین ہے کہ آپ اِن سے اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں ۔ اور میرے ساتھ اِن کا تعارف کروانا اب آپ کا پہلا فرض ہے ۔"

یوسف مسکرایا ۔ "خان صاحب ! یہ ہیں ایم ای ایس کے اور سیئر ، اِن کا نام محمد صدیق ہے اور یہ پنجاب کے ایک شہر لدھیانہ کے رہنے والے ہیں ۔ ایس ڈی او صاحب جن کے ہاں یہ ٹھہرے ہوتے ہیں ان کا نام محمد سعید ہے اور وہ بھی لدھیانے سے ہی تعلق رکھتے ہیں ۔"

احمد خان نے غور سے محمد صدیق کی طرف دیکھا ۔ وہ کوئی تیس بتیس سال کا قوی الجثہ اور خوش وضع آدمی تھا ۔ چہرے پر سادگی اور شرافت تھی ۔

اُس نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا ۔

"دیکھو ! یوسف صاحب ! اب ہمیں نیچے پہنچنے کے لیے اپنی ٹانگوں پر اپنا بوجھ اٹھانا ایک مجبوری ہے ۔ میں آپ سب سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ اگر میں تیز نہ چلوں تو تم میرا مذاق نہیں اُڑاؤ گے ۔"

محمد صدیق نے کہا ۔ "خان صاحب ! میں تو ساری عمر ویسے بھی آپ کا احترام کرتا رہوں گا اور یوسف کی حالت یہ ہے کہ اُن کے نزدیک آپ کا یہاں تک پہنچنا ایک کارنامہ ہے ۔ یہ سارا راستہ آپ ہی کے متعلق باتیں کرتے آئے ہیں ۔"

نیچے اُترتے ہوئے احمد خان سب سے آگے تھا ۔ گل محمد نے کھڈ کے قریب اُس کا سہارا بننے کی کوشش کی لیکن احمد خان نے اسے جھڑک دیا ۔

ایک گھنٹہ بعد وہ موٹر پر سوار ہو رہے تھے ۔

محمد صدیق نے کہا ۔ "خان صاحب ! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو ایس ڈی او صاحب آپ سے مِل کر بہت خوش ہوں گے ۔"

احمد خان نے جواب دیا ۔ "بھئی ! آج تو مَیں گھر جا کر نہانے ، کھانا کھانے اور اُس کے بعد سونے کے سوا اور کچھ نہیں کروں گا ۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں ، کھانا کھائیں اور کچھ دیر آرام کریں پھر میرا ڈرائیور آپ کو ایس ڈی او کے گھر چھوڑ آئے گا ۔"

محمد صدیق نے پُوچھا ۔ "خانصاحب ! آج آپ چائے پر آسکیں گے ؟"

"نہیں بھائی ! ایک دو دن مجھے آرام کرنا چاہیے اُس کے بعد دیکھا جائیگا ۔"

"یوسف صاحب آپ تو ضرور آئیں گے نا ؟"

احمد خان نے فوراً کہا "ہاں بھئی یہ ضرور آئیں گے ۔"

باب - ۲

یوسف نے دوپہر کو دو گھنٹے گہری نیند سونے کے بعد اُٹھ کر غسل کیا۔ اور عصر کی نماز کے بعد کار پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو اُسی بنگلے کی طرف چلنے کو کہا جہاں وہ دوپہر کے وقت محمد صدیق کو چھوڑ کر آیا تھا۔

کار کا ہارن سنتے ہی ایک کم سن بچی بھاگتی ہوئی باہر نکلی اور بڑی خود اعتمادی سے کار کے قریب پہنچ کر بولی۔

"آپ یوسف صاحب ہیں نا؟ اندر آجائیں۔ آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے"۔

سُرخ و سفید، بھورے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی یہ بچی دس سال سے کم عمر کی ہوگی، لیکن اُس کی گفتگو سے ذہانت اور شعور کی پختگی مترشح تھی۔

"آپ ایس ڈی او صاحب کی بیٹی ......"

"جی وہ میری نانی کے خالہ زاد بھائی ہیں" لڑکی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "اور محمد صدیق صاحب؟" "جی وہ رشتے میں میرے ماموں ہیں۔ یعنی میرے نانا جی کے بھائی کے بیٹے"۔

اتنی دیر میں محمد صدیق باہر نکل آیا اور اُس نے یوسف سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"مجھے معلوم تھا کہ اس باتونی لڑکی نے آپ کا راستہ روک رکھا ہوگا اور پہیلیوں کا قصہ یہیں شروع کر دے گی"۔

بچی نے غصے سے منہ پھیر لیا اور جب وہ منہ بسورتی ہوئی واپس جانے لگی تو یوسف نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا: "صدیق صاحب! غضب کرتے ہیں آپ بھی! آپ اس شہزادی کو باتونی لڑکی کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک آپ نے اِسے غور سے نہیں دیکھا"۔ لڑکی نے رُک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ یوسف نے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"جی نسرین" اُس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"صرف نسرین نہیں جی بلکہ شہزادی نسرین۔ محمد صدیق صاحب!" یوسف نے کہا: "آپ اس کے متعلق جس قدر سوچیں گے اُسی قدر زیادہ آپ کو اس کے لیے شہزادی نسرین کا نام پسند آئے گا"۔

صدیق نے کہا۔ "بھائی میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب اس کی نانی کو اس کے اس نئے نام کا پتہ چلے گا تو اس کی عید ہو جائے گی۔ وہ ہمیں بھی بہت سی دُعائیں دیں گی۔ چلیے اب آپ کا اندر انتظار ہو رہا ہے"۔

وہ بنگلے کے ایک کمرے میں داخل ہوئے وہاں گھر کے چند افراد موجود تھے۔

ایس ڈی او نے اُٹھ کر یوسف سے مصافحہ کیا۔

ایک خاتون نے جس کے چہرے پر معمر ہونے کے باوجود غیر معمولی دلکشی تھی۔ یوسف سے کہا:

"بیٹا! تمہیں اللہ تعالیٰ عزت دے، عمر دراز کرے، ترقی دے اور تمہارے والدین تمہاری خوشیاں دیکھیں۔ تم ہمارے لیے ایک فرشتۂ رحمت بن کر کوئٹہ آئے ہو"۔

یوسف نے شرماتے ہوئے کہا۔ "ماں جی! یہ شاید میری خوش قسمتی تھی کہ میں

اُس وقت وہاں پہنچ گیا اور یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ سندھ کے ایک رئیس کو اچانک میری دیکھا دیکھی پہاڑ پر چڑھنے کا خیال آگیا۔ بچوں کو ہر وقت بزرگوں کی دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مَیں یہاں اس لیے نہیں آیا کہ آپ میرا شکریہ ادا کریں۔ کیونکہ جب آپ میرے لیے دعا کریں گی تو میں شکریہ ادا نہیں کر سکوں گا۔ مَیں یہی سمجھوں گا کہ ایک شفیق ماں کا یہی فرض ہے۔"

دروازے کی طرف سے ہلکے ہلکے قہقہے سنائی دیے۔ ——

محمد صدیق نے کہا۔ "آپا جان! آپ کو مبارک ہو۔ مجھے خالی نسرین کے لفظ سے الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ یوسف صاحب نے اسے دیکھتے ہی اس کا نام شہزادی نسرین رکھ دیا ہے اور میں حیران ہوں کہ ہم میں سے آج تک کسی کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ نسرین بیٹی کا نام شہزادی نسرین ہونا چاہیے تھا۔"

معمر عورت مسکرائی۔ "اچھے لوگوں کے منہ سے ہمیشہ اچھی باتیں ہی نکلتی ہیں۔ نسرین مجھے ہمیشہ ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی لیکن مَیں دوسروں کے سامنے اِسے شہزادی کہتے ہوئے جھجکتی رہی۔ ویسے میری تینوں بیٹیاں شہزادیاں ہی ہیں، یعنی اِس کی دوسری بہنیں بھی شہزادیاں ہیں۔ لیکن یہ میری بیٹی کوئی خاص شہزادی ہے۔"



نسرین کے ساتھ ایک معزز مہمان کا سا سلوک ہو رہا تھا اور وہ یوسف کے بائیں ہاتھ اپنی نانی اماں کے ساتھ بیٹھی خاموشی سے ان کی گفتگو سُن رہی تھی۔ ایس ڈی او کی جواں سال بیٹی نے یہ سوال پُوچھا کہ یہاں سے کوہ مردار کی چوٹیاں دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ آپ کو اور ماموں جان کو اُن تک پہنچنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

صدیق میاں نے کہا۔ "بیٹی! اگر ہمت ہو تو بلندیاں، ہمیں آگے بڑھنے کی

ترغیب دیتی ہیں۔ میں وہاں اِس لیے چلا گیا تھا کہ یہ پہاڑ زیادہ قریب تھا۔

یوسف بولا۔ "میرا وہاں جانا محض اتفاق تھا۔ اگر کل شام اچانک اسلامیہ کالج لاہور کے بعض دوست نہ مل جاتے تو میں آج گاڑی میں سفر کر رہا ہوتا۔ پروگرام ان کا تھا۔ میں ان کا ساتھ دینے پر تیار ہوگیا۔ جب میں پہاڑ کے دامن میں پہنچا تو وہ وہاں نہیں پہنچے تھے۔ اب خدا جانے میرے میزبان کے دل میں کیا آئی تھی کہ وہ میرے ساتھ آگئے تھے اور ایک پستول، ایک بندوق اور ایک دُوربین بھی ساتھ لے لی تھی۔ اُس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ساز و سامان آپ کے ماموں جان کو بھیڑیوں سے بچانے کے کام آئے گا۔"

محمد صدیق نے پُوچھا "آپ کب جا رہے ہیں؟"

"جی! میں انشا اللہ کل چلا جاؤں گا۔"

ایس ڈی او محمد سعید نے معمر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپا جان! آپ کا کام بن گیا۔ اللہ نے آپ کو قابلِ اعتماد ساتھی دے دیا ہے اور میری یہ پریشانی دُور ہوگئی ہے کہ آپ کے ساتھ کس کو بھیجا جائے۔"

"بھئی میں چھوٹی بچی نہیں۔ میں بہت سفر کر چکی ہوں۔ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ ایک بیٹا میرے ساتھ ہوگا اور راستے میں میری شہزادی نسرین کو بھی خوش رکھے گا۔"

محمد سعید نے کچھ سوچ کر کہا:

"یوسف صاحب! کیا یہ بہتر نہ رہے گا کہ آپ کل کی بجائے پرسوں جائیں؟ میں آپ کے ساتھ احمد خاں صاحب کے پاس جاؤں گا اور اُن سے درخواست کروں گا کہ کل دوپہر آپ اور وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں اور پھر آپ کو ہمارے پاس ایک یا دو دن رہنے کی اجازت دے دیں۔"

"یوسف صاحب! ایس ڈی او نے اس معمر خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ معزز خاتون بیگم فریدہ احمد ہیں اور نسرین، میرا مطلب ہے شہزادی نسرین، ان کی بہت لاڈلی بلکہ سارے خاندان کی لاڈلی اِن کی سب سے چھوٹی نواسی ہے محمد سعید کی چھوٹی بیٹی بولی" اباجی نسرین کہتی ہے کہ سب سے لاڈلی فہمیدہ ہے اور نانی جان جب جالندھر جائیں گی تو اسے شہزادی کہنا شروع کر دیں گی۔

مسز احمد بولی "نہیں بیٹی شہزادی ہمیشہ چھوٹی بیٹی ہوتی ہے۔"

—— ○ ——

چائے پینے کے بعد وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

مغرب کی نماز کے بعد وہ پھر ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے اور بعد میں یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا "اب مجھے اجازت دیجیے۔ خانصاحب میرا انتظار کر رہے ہونگے میں دوپہر کی دعوت کے متعلق ان سے کہہ دوں گا اور اگر وہ اس عرصے میں کسی اور کی دعوت قبول نہیں کر چکے ہوں گے، تو ضرور آئیں گے۔"

"میں خود کیوں نہ تمہارے ساتھ چلوں۔"

"نہیں! آپ کو تکلیف ہوگی، لیکن ٹھہریے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خانصاحب کی کار آ رہی ہے۔"

—— کار بنگلے کے قریب آ کر رُکی! احمد خان کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یوسف نے آگے بڑھ کر کہا:

"خان صاحب! السلام علیکم! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔" "بھائی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" احمد خان نے کہا:

"تم کچھ عرصہ میرے پاس رہو تو میری بہت سی عادتیں بدل جائیں گی۔"

"خان صاحب! یہ ایس ڈی او محمد سعید ہیں۔"

احمد خان نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"اب آپ سب حضرات چلیں اور میرے ساتھ کھانا کھائیں۔"

محمد صدیق نے کہا۔ "نہیں خان صاحب پھر سہی آپ جب بلائیں گے۔ ہم حاضر ہو جائیں گے۔ ویسے ہم یہ درخواست لے کر آپ کے پاس حاضر ہونے کے متعلق سوچ رہے تھے کہ کل دوپہر آپ ہمارے ہاں کھانا تناول فرمائیں۔"

احمد خان بولا "اگر یوسف صاحب رُک جائیں تو مجھے آپ کے ساتھ کھانا کھانے میں بہت خوشی ہوگی۔"

سعید بولا "جناب! یوسف کو ہم نے یہیں روک لیا ہے۔ کل شام وہ آپ سے اجازت لے کر ہمارے پاس آ جائیں گے اور پرسوں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ —— انہیں ہم اِس لیے زحمت دے رہے ہیں کہ وہ ہماری ایک قریبی رشتہ دار کو راستے میں اُن کے گھر پہنچائیں گے۔

احمد خان نے کہا۔ "اگر آپ نے یوسف صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا ہے تو مجھے اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

محمد صدیق نے کہا۔ "خان صاحب! یوسف صاحب کی رضامندی کا انحصار آپ کی رضامندی پر ہے۔"

احمد خان نے کہا۔ "بھئی! آپ یوسف صاحب کو دو چار دن اور نہیں روک سکتے۔"

"خان صاحب! اگر یہ رُک جائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی اور اس بہانے سے ہم اپنی آپا جان کو بھی روک سکیں گے۔"

احمد خان نے مسکراتے ہوئے سوال کیا: "کیوں یوسف صاحب! آپ بلوچستان

کے دوسرے پہاڑ دیکھنا پسند نہیں کریں گے؟"

یوسف: "خان صاحب! مَیں آپ کے ساتھ زیارت دیکھ چکا ہوں اور وہاں سے بابا خرواری جاکر مَیں نے جو دلکش مناظر دیکھے ہیں ان کے دیکھنے کے بعد میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے بلوچستان کے کوہساروں کے حصّے کا بیشتر حُسن خلیفت کے دامن میں بکھیر دیا ہے اور اب اگر موقعہ ملا تو مَیں یہاں صرف برف باری دیکھنے آؤں گا۔

لیکن، خان صاحب! "مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے ایک بار کانگڑہ کے پہاڑ دیکھ لیے تو پھر آپ ہر سال وہاں جایا کریں گے"۔

احمد خاں بولا: انشاء اللہ! اگلے سال کانگڑہ ضرور جاؤں گا۔ "لیکن شرط یہی ہوگی کہ آپ میرے ساتھ چلیں"۔

محمد صدیق نے کہا: خان صاحب! یوسف صاحب نے ٹھیک کہا ہے: کانگڑہ بہت خوب صورت ہے اور وہاں حسبِ منشا شکار ہوتا ہے، جنگلی مرغیوں سے لے کر ریچھ، چیتے اور شیر تک"۔

احمد خان نے کہا: "چلیے یوسف صاحب! امید ہے کہ آپ کو رخصت کرنے سے پہلے مجھے کئی سالوں کا پروگرام بنانا پڑے گا۔ ممکن ہے میں ستمبر کے شروع میں کانگڑہ جانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ مجھے خط لکھتے رہیں کیونکہ اگر کوئی ساتھی آوازیں دینے والا نہ ہو تو میں حرکت میں نہیں آیا کرتا"۔

یوسف نے کہا: "خان صاحب! مَیں آپ کو خط لکھتا رہوں گا۔ انشاءاللہ۔ اور آپ پروگرام بنا لیجئے گا"۔

یوسف، محمد صدیق اور محمد سعید سے مصافحہ کرکے احمد خاں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

اور جب گاڑی سٹارٹ ہو رہی تھی تو محمد صدیق نے آگے بڑھ کر پوچھا:

"خان صاحب! آپ کل دوپہر کے کھانے پر خود ہی پہنچ جائیں گے یا مَیں آپ کو لینے آؤں"۔

"بھئی! مَیں خود ہی آجاؤں گا"۔ احمد خان نے کہا: "اور میرا خیال ہے کہ ہم وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر شام کو آپ میرے ہاں چائے پئیں گے اور اس کے بعد یوسف کو آپ کے ساتھ یہاں واپس پہنچا دیا جائے گا"۔



اُن کے جانے کے تھوڑی دیر بعد محمد سعید کے گھر میں چند خواتین اور لڑکیاں جمع ہو گئیں اور خاتون خانہ سے گلہ کرنے لگیں کہ آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ وہ بہادر لڑکا جس نے محمد صدیق کی جان بچائی ہے آپ کے پاس چائے کے لیے آیا ہے"۔

"بھئی! وہ کل پھر آئے گا۔ چاہو تو اُسے اچھی طرح دیکھ لینا!

محمد سعید کی بیٹیوں نے اپنی سہیلیوں کو یہ بتا دیا تھا کہ اُس نے نسرین کو دیکھتے ہی اس کا نام شہزادی نسرین رکھ دیا تھا اور وہ سب اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔

ایک لڑکی نے سعید کی بیوی سے کہا: "چچی جان! آپ اُس سے ضرور پوچھیں کہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟"

"واہ بھئی! مَیں کیوں پوچھوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟"

دوسری لڑکی نے نسرین سے مخاطب ہو کر کہا۔

اچھا شہزادی نسرین صاحبہ —— آپ ہی یہ بتا دیں کہ شہزادی کیسی ہوتی ہے"؟

"مجھے کیا معلوم وہ کیا ہوتی ہے۔ کل یوسف بھائی جان سے پوچھ کر بتاؤں گی"۔

باب - ۳

اگلے روز محمد سعید کے ہاں یوسف اور احمد خاں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے علاوہ چند اور مہمان بھی تھے۔ ایک عبدالحمید ای، اے، سی انتہائی با اثر پٹھانوں کے سردار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرا ایک صحافی تھا اور تیسرا کالج کا پروفیسر تھا۔ کوہِ مردار کے بھیڑیوں کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی اور یوسف کو مختلف سوالات کے جواب میں ساری داستان ایک بار پھر سنانی پڑی۔ تیمور علی خان نے کہا: "میں نے مقامی لوگوں سے سُنا ہے کہ کوہِ مردار پر انتہائی خوفناک بلائیں رہتی ہیں لیکن میں سوچتا ہوں کہ ایسی ویران جگہوں پر کوئی بلا بھوکے بھیڑیوں سے زیادہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔"
پروفیسر نے کہا: "یہ ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کا پہلے بھی کبھی کسی درندے سے سابقہ پڑا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا "جناب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا تو مجھے ایک ناقابلِ یقین واقعہ پیش آیا۔ ہمارے علاقے میں گنّا بہت زیادہ ہوتا ہے اور ہمارے ایک کھیت میں ایک نئی قسم کا گنّا جو چوسنے میں بہت نرم ہوتا ہے کاشت کیا گیا تھا۔ اِس کھیت سے پہلے دو اور کھیت راستے میں آتے تھے۔ ہمیں وہاں پہنچنے کے لیے ایک کھائی میں سے گزرنا پڑتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا تھا جب کھائی خشک ہوتی تھی۔ ایک شام میں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہاکی کھیلتے کھیلتے گنّوں کے لیے اس کھیت کی طرف چل دیا۔ نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد

میں نے اچانک دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ شام ہو رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں چند گنّے توڑ کر واپس بھاگ آؤں گا۔ اب چھوٹے بھائی کے آجانے سے مجھے پریشانی ہوگئی وہ مجھ سے چھ سال چھوٹا تھا اور دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔
ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں کماد کے کھیتوں کے درمیان تھوڑی جگہ خالی تھی میں نے چھوٹے بھائی کو وہاں کھڑا کیا۔ جلدی جلدی چند گنّے توڑے اور خالی جگہ آکر ان کے چھلکے اتارنے لگا۔ اچانک مجھے آہٹ سنائی دی۔ دو کھیتوں کے درمیان ایک پتلی سی منڈیر حدِ فاصل کا کام دے رہی تھی اور خالی جگہ سے چند فٹ آگے دونوں طرف سے کماد کے گرے ہوئے خشک پتوں میں چھپ گئی تھی اور ان پتوں پر کسی جانور کے چلنے سے دھیمی دھیمی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید یہ میری چھٹی حِس تھی کہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بازو سے پکڑ کر اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔ جوں جوں آہٹ قریب آرہی تھی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی پھر نیچے لٹکتے ہوئے سوکھے پتوں سے اُس کا سر نمودار ہوا۔ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ پندرہ فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔" یوسف یہاں تک کہہ کر رکا۔ پروفیسر اور دوسرے لوگوں نے یک زبان ہو کر پوچھا "بھئی وہ کیا تھا؟"
یوسف نے اطمینان سے جواب دیا "میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا تھا۔ وہاں شام کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ مجھے کتنی دیر دیکھتا رہا! اُس کی آنکھیں یقیناً ایک درندے کی آنکھیں تھیں۔ اُس کا قد کتے سے یقیناً بڑا تھا۔ اُس نے اچانک منہ موڑ لیا اور جس طرح آیا تھا اُسی طرح قدم اٹھاتا ہوا غائب ہو گیا۔"

دروازے کی اوٹ سے عورتوں کی کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں۔ ای اے سی نے سوال کیا: "جب وہ مڑا تھا۔ آپ یہ نہیں دیکھ سکے کہ وہ کیا تھا؟"

"جناب! مَیں اُسے اِس لیے بھی اچھی طرح نہ دیکھ سکا کہ اُس کا رنگ کماد کے خشک پتوں سے ملتا جلتا تھا۔ مَیں صرف اُس کی چمکدار آنکھیں دیکھ سکا تھا اِس کے علاوہ مَیں صرف یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی دُم کافی لمبی تھی۔

اِس کے بعد میں نے اپنی ہاکی اٹھائی۔ اور چھوٹے بھائی سے کہا بھاگو وہ شاید یہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔ وہ بھاگا اور چند سیکنڈ کے بعد مَیں بھی اس سے جا ملا اور جب ہمارے درمیان کچھ فاصلہ ہو گیا ...... تو میں بھی بھاگ کر اُس سے جا ملا۔ اب ہم کھیتوں سے باہر آ چکے تھے۔"

پروفیسر نے پوچھا "آپ رُک کیوں جاتے تھے جناب؟"

"پروفیسر صاحب! درندے سے زیادہ مجھ پر اس بات کا خوف سوار تھا۔ کہ اگر درندے نے حملہ کر دیا تو میرا بھائی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اسی لیے مَیں اس کے پیچھے رہنا چاہتا تھا۔"

ای اے سی نے پوچھا "بھائی! پھر آپ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سا جانور تھا؟"

"جناب! اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گاؤں کے لوگ اس کا مذاق اڑاتے، لیکن یہی باتیں میں نے وہاں کہی تھیں اور کسی نے میرا مذاق نہیں اڑایا میرے والد اتفاق سے گھر آئے ہوئے تھے۔ مَیں نے انھیں بتایا تو انہیں بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ مَیں نے کوئی خطرناک درندہ ضرور دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شیر کا یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ وہ لگڑ بگڑ بھی ہو سکتا تھا۔

گاؤں کے پندرہ بیس جوان لاٹھیاں اُٹھا کر تیار ہو گئے اور انہوں نے ابّا جان سے درخواست کی کہ آپ بندوق لے کر ہمارے ساتھ چلیں لیکن انہوں نے سمجھایا کہ رات کے وقت کسی درندے کے پیچھے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔

"اگلے دن اُس جگہ سے کوئی سو قدم دُور ایک کُتّے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ جس کا کچھ حصّہ اُسے ہلاک کرنے والا درندہ ہڑپ کر چکا تھا۔

ہمارے علاقے کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے کماد کے کھیت دوسرے گاؤں سے مل جاتے تھے۔ کہیں راستے میں کوئی نہر یا سڑک آتی تھی تو اس سے آگے پھر گنّے کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اِس لیے کسی درندے کا پہاڑی علاقے سے نکل کر اس طرف آ جانا ناممکن نہیں تھا۔"

پروفیسر نے کہا: "دیکھیے برخوردار! اگر آپ یہ بتا سکیں کہ جب آپ نے قدموں کی آہٹ سُنی تھی اور پھر جب آپ نے درندے کے چہرے کا کچھ حصّہ دیکھا تھا تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟"

یوسف نے جواب دیا "جی مجھے معلوم نہیں کہ میری ذہنی کیفیت کیا تھی؟"

"بہر حال آپ ایسی باتیں کہہ سکتے ہیں کہ خوف سے آپ کے ذہنی قویٰ شل ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ اچانک اس قدر سنبھل گئے تھے کہ آپ کو اپنی جان سے زیادہ اپنے بھائی کی جان کا خوف تھا، اور پیچھے رہ کر آپ اس کے لیے ڈھال بننا چاہتے تھے۔"

یوسف نے جواب دیا۔ "پروفیسر صاحب میرے قویٰ شل نہیں ہوئے تھے اگر میں ڈرنے میں کوئی فائدہ دیکھتا تو یقیناً ڈرتا لیکن میں اس عمر میں بھی حقیقت پسند تھا۔" پروفیسر نے کہا "آپ کا دل تو دھڑکتا ہو گا؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "جناب اُس وقت دل کی دھڑکن سننے کی فرصت نہ تھی" اور وہ سب ہنس پڑے۔

احمد خان نے کہا۔ "یوسف عام لوگوں سے بہت مختلف ہے اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ یہ غار میں ستانے والی شیرنی کا بچّہ اٹھا لایا ہے تو مَیں یقین کر لوں گا۔"

محمد صدیق نے کہا "خان صاحب! یوسف صاحب کے متعلق ایسی باتوں پر مجھے بھی یقین آجائے گا۔"

پروفیسر نے کہا "یوسف صاحب! مجھے درندوں کا کوئی تجربہ نہیں، لیکن آپ شاید اس کی معقول وجہ بیان کر سکیں کہ ایک درندہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آپ کے قریب آیا اور آپ پر حملہ کیے بغیر واپس چلا گیا۔"

یوسف نے جواب دیا "پروفیسر صاحب، شاید وہ اپنا شکار چھوڑ کر آیا تھا اور اسے نئے شکار کی ضرورت نہیں تھی۔ درندہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے شکار کرتا ہے جب بھوک ختم ہو جاتی ہے تو وہ امن پسند بن جاتا ہے۔"

صحافی نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے جب بھوک مٹ جاتی ہے تو درندے بھی عدمِ تشدد کے اصول پر کاربند ہو جاتے ہیں۔"

یوسف نے کہا "نہیں جی درندے پر پیٹ بھرتے ہی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے اور وہ کہیں چھپ کر سو جاتا ہے۔ اہنسا یا عدمِ تشدد کے فلسفے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ——

اہنسا اُن سیاستدانوں کا کھیل ہے جو طاقت ور کے پاؤں پر گرتے ہیں اور کمزور کا گلہ گھونٹتے ہیں۔

عدمِ تشدد کا واحد مقصد مسلمانوں کو لوریاں دے کر سلانا ہے اور ہندوؤں کو خون کی ندیاں بہانے کے لیے تیار ہونے کے مواقع فراہم کرنا ہے۔"

پروفیسر مسکرایا "یعنی آپ کے خیال میں عدمِ تشدد ایک ڈھونگ ہے۔"

یوسف نے جواب دیا: جناب "! میری ترجمانی کے لیے آپ اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کر سکتے ہیں۔"

سب لوگ یوسف کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ نہایت اطمینان سے

بول رہا تھا:

"آج تک کانگرس کا ایک ہی مطالبہ رہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ انگریز یہاں سے نکل جائیں، بلکہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی صورت میں وہ کانگرس کو ملک کی واحد نمائندہ جماعت مان لیں اور مسلم لیگ کو جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اپنی واحد نمائندہ جماعت سمجھتی ہے۔ نظر انداز کر دیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب اچھوتوں کے علیحدہ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوا تھا تو گاندھی جی نے مرن برت کی دھمکی سے انہیں بے دست و پا کر دیا تھا۔

جناب پروفیسر صاحب! ہماری تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم سو رہے ہیں اور گاندھی اور نہرو کے اعصاب پر یہ خوف سوار ہے کہ یہ مسلمان جنہوں نے ایک ہزار برس اس برِصغیر پر حکومت کی ہے۔ انگریز کے جاتے ہی کہیں ایک بار پھر ملک کا اقتدار نہ سنبھال لیں اور دراصل یہی عدمِ تشدد کا فلسفہ ایک ایسے عفریت کے چہرے کا نقاب ہے، جو آگے چل کر ظلم و وحشت اور سفاکی کی تاریخ میں یقیناً ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔"

پھر اُس نے اپنا رُخ بدلا اور صحافی سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"جناب! گستاخی معاف میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

صحافی نے جواب دیا۔ "بھائی میری ملازمت کراچی میں ہے لیکن میرا گھر احمد آباد میں ہے۔"

"معاف کیجیے! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو اپنے خیالات پر بہت جلد نظرِ ثانی کرنا ہو گی: مسلمان اس وقت آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں اور اگر آج ان میں سے کوئی قائدِ اعظم کی زبان نہیں سمجھتا تو اگر وہ بدنیّت نہیں تو

بیوقوف ضرور ہے"۔ کانگرسی ذہن کا یہ صحافی شکست خوردہ نگاہوں سے یوسف کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تیمور خان نے کہا" آپ نے یہاں رہ کر بلوچستان کے حالات کا تھوڑا بہت تجزیہ کیا ہوگا۔ مَیں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کی رفتار سے آپ مطمئن ہیں؟" یوسف نے جواب دیا:

"خان صاحب کو کچھ معززین ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں اور مَیں ان کی گفتگو سنتا رہا ہوں۔ اِس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر عام لوگوں سے بھی گفتگو کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کا کام صحیح خطوط پر شروع نہیں ہوا۔ یہاں ایک قبائلی نظام ہے اور بلوچستان میں وہی سیاست کامیاب ہوگی جسے قبائل کے سربراہوں کی حمایت حاصل ہوگی۔ اگر پچاس یا پچپن قبائل کے سرداروں کو پاکستان کا حامی بنا لیا جائے تو یہاں پر پاکستان کی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ قبائل کے عوام ہر قیمت پر اپنے سرداروں کا ساتھ دیں گے۔ یہاں قبائلی عصبیت کی یہ حالت ہے کہ کوئی لیڈر خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ دوسرے قبیلے کے ایک عام آدمی کو بھی اپنے پیچھے نہیں لگا سکتا۔ یہاں جب شاہی جرگہ کے ارکان ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں گے تو یہ سمجھ لیجیے کہ پورا بلوچستان ان کے پیچھے کھڑا ہے۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو پورے بلوچستان میں زیادہ سے زیادہ ایسے پچاس ساٹھ معززین سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا جو سردار گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں اور اپنے سردار پر اثر انداز ہو سکتے ہوں"۔

تیمور خان نے کہا:"بھائی واللہ! آپ میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں، مَیں چند آدمیوں کا ایک وفد بناؤں گا اور پھر ہم ہر با اثر آدمی کے پاس جائیں گے۔ خواہ مجھے اس مقصد کے لیے ملازمت ہی کیوں نہ چھوڑنی پڑے"۔

یوسف! کہہ کر وہ پھر اس کی طرف دیکھنے لگا:" اگر آپ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی اور فیصلہ نہیں کر چکے تو میں آپ کو یہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو اپنے حالات آزادی سے تحریکِ پاکستان کے لیے کام کرنے کی اجازت دے سکیں اور کسی دشواری کی وجہ سے آپ نے اپنی زندگی کا کوئی خاص پروگرام نہ بنا رکھا ہو تو میں آپ کو یہاں آکر کام کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ یہاں ایسے لوگ ہیں جو آپ کے راستے میں اقتصادی مشکلات حائل نہیں ہونے دیں گے"۔

یوسف نے چند ثانیے سوچنے کے بعد جواب دیا" جناب! میرے سامنے اہم ترین مقصد یہی ہے کہ مَیں حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں ان لوگوں کا ساتھ دوں جو اسے مسلمانوں کی موت و حیات کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس معرکے میں میرا سب سے بڑا ہتھیار میرا قلم ہے! اپنے متعلق مَیں اب تک صرف اِتنا جانتا ہوں: کہ مَیں اپنی قوم کے جوانوں کو ان کے ماضی کی ولولہ انگیز، روح پرور اور سبق آموز داستانیں سنانے کے لیے پیدا ہُوا ہوں۔ مَیں تاریخ کا طالب علم ہوں اور ماضی کی تاریخ میرے لیے ایک آئینہ ہے جس کی بدولت مستقبل کے خدوخال سنوارے جا سکتے ہیں۔ مَیں اپنے دل میں وہ تڑپ رکھتا ہوں جو مجھے ہمیشہ بے چین اور بے قرار رکھتی ہے اور اِسی بے چینی اور بے قراری کے باعث میرے دماغ میں ان گنت داستانیں جنم لیتی ہیں۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی دلچسپ داستانیں پہلے کبھی نہیں لکھی گئیں۔ میری قوم کی موجودہ اور آئندہ نسلیں انہیں بہت پسند کریں گی اور متاثر ہوں گی اور ان میں سے کئی پاکستان کے نقیب اور معمار بن جائیں گے۔ خان صاحب! علامہ اقبال، قائدِ اعظم اور نواب بہادر یار جنگ کا پاکستان وہ خطۂ زمین ہوگا جہاں ہم اپنے ناقابلِ شکست قومی حصار تعمیر کریں گے اور میں اپنے قلم سے اس ناقابلِ شکست ذہنی اخلاقی اور روحانی حصار کے نقشے تیار کروں گا۔ آپ

کو میری یہ بات سُن کر یقیناً حیرت ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میری داستانوں پر ناول کا لفظ چسپاں ہوگا اور جب یہ ناول پڑھے جائیں گے تو کسی کو میری دماغی حالت پر شک نہیں ہوگا"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نظر میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو آپ کی دماغی حالت پر شک کرتے ہیں؟" صحافی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ ایسے لوگ ہیں اور میں انہیں بڑی جلدی پہچان لیتا ہوں۔ اس وقت آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہونے کے باوجود ان میں سے ایک ہیں۔"

پروفیسر نے کہا: "دیکھئے یوسف صاحب! یہاں آپ کا کوئی دشمن نہیں، آپ ایک تعلیم یافتہ اور صحت مند انسان ہیں اور کوئی آپ کو مستقبل کے متعلق سہانے خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ تاہم ہمیں اس بات سے دلچسپی ضرور ہے کہ اس دنیا میں رہنے کے لیے اور اس دنیا میں زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ پیدائشی طور پر ایک خوشحال آدمی ہیں اور آپ کے گھر میں وہ سب کچھ ہے جسے آرام کی زندگی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے تو آپ کو یا آپ کے کسی خیر خواہ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں لیکن اگر ایسی بات نہیں تو پھر آپ سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اپنی روزی کے لیے کیا کام کریں گے۔"

یوسف نے جواب دیا۔ "دیکھئے صاحب! میرے دل میں ایسے ناول لکھنے کا ہرگز ارادہ نہیں جو مجھے عزت کی روٹی بھی نہ دے سکیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے نہیں، کھلی آنکھوں سے اپنے لیے یہ راستہ تلاش کیا ہے۔ ویسے آپ میں سے اگر کوئی صاحب دنیا کے بڑے بڑے ناول نگاروں کے متعلق کچھ

جانتے ہوں تو میں یہ بتا سکتا ہوں کہ گذشتہ دو تین صدیوں سے ادب میں ناول نگاری ہی ایک مقبول ترین صنف ہے اور میں ایسے بیسیوں ناول نگاروں کے نام لے سکتا ہوں جنہوں نے مقبولیت بھی حاصل کی اور جن کی آمدنی بھی بے حد و حساب ہوتی تھی۔ جن کی زندگی میں ہی ان کی تصانیف کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو گئے اور دُنیا کی متعدد زبانوں میں ان کے تراجم بھی شائع ہو گئے تھے۔ لیکن میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میرے دل میں ان کی وجہ سے یا ان کو سامنے رکھ کر اپنا حساب کتاب جوڑنے سے یہ شوق پیدا ہُوا ہے۔ میرے لیے ناول نگاری اس قومی ابتلاء کے زمانے میں واحد محاذ ہے جہاں میں اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن ادا کر سکتا ہوں۔ میرے نزدیک اہمیت اس مقصد کی ہے جس کے لیے میں لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ مجھے روٹی کتنی ملے گی۔

جس بھنور میں میں اپنی قوم کو دیکھ رہا ہوں۔ اس سے نکالنے کے لیے مجھے اگر بھوکا بھی رہنا پڑے اور میرا مقصد پورا ہو جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ جب قوم کو اپنی بقا کے خطرات درپیش ہوں تو میں اپنے شاندار کیریئر کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ناول کے متعلق سوچتے ہوئے میں اپنے اندر ایک خود اعتمادی پاتا ہوں۔ شاید آپ کے دل میں یہ خیال آتے کہ میں اپنے خدشات دُور کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہا ہوں۔"

نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ نے مجھے اگر کوئی صلاحیت دی ہے تو اس کا صحیح استعمال کرنے کے بعد میری روزی اسی کے ذمہ ہے زیادہ یا کم ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے حصولِ وطن راشن جمع کرنے سے بہت اہم ہے۔"

وہ سب خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ احمد خان نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" دیکھو بھئی یوسف! اگر تم وہی ہو جو تم اپنے آپ کو سمجھتے ہو تو یقین مانو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہ تمہیں کبھی بھی مایوس نہیں ہونے دے گا۔"

تیمور خان نے کہا" یار! میں تو تمہاری گفتگو کے دوران یہ محسوس کر رہا تھا کہ پاکستان کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے اور اس کے باہمت معمار جب تھک جاتے ہیں تو تمہاری کتاب اٹھا کر چند صفحات پڑھنے کے بعد تازہ دم ہو کر پھر کام پر لگ جاتے ہیں اور یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنی قوم کے لئے ایسا ادب پیدا کرنے والا بھوکا بھی رہ سکتا ہے۔ میرے بھائی! میں ہر نماز کے بعد آپ کے لئے دعا کروں گا۔"

احمد خان صاحب نے کہا" یار! ایک بات عجیب ہے۔ صرف چند دن قبل یوسف صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے وہ بہت چھوٹے نظر آئے۔ پھر بھیڑیوں کا واقعہ پیش آیا تو مجھے یہ افسوس ہوا کہ یہ اپنے قد و قامت اور عمر میں بڑے ہو گئے ہیں اور آج میں یوسف صاحب کے چہرے پر بزرگی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میرے بھائی! اللہ تمہیں ہمت دے تم کوئی ایسی چیز ہو جسے میں نہیں سمجھ سکتا۔ آج سے میں یہ دعا کیا کروں گا کہ تمہارا ہر خواب پورا ہو۔"

اور پھر وہ سعید کی طرف مخاطب ہوا" سعید صاحب! مجھے اچھا کھانا کھانے کے بعد فوراً نیند آجایا کرتی ہے۔ اور آپ کا کھانا بہت ہی اچھا تھا! اس لئے میں اجازت چاہتا ہوں۔ آپ چائے پر ضرور آئیں۔ یوسف صاحب اگر رکنا چاہتے ہوں تو رک جائیں۔ وہ آپ کے ساتھ آجائیں گے۔"

یوسف بولا" نہیں خان صاحب! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے

بھی نیند آرہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف احمد خاں کے ساتھ کار پر اس کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔

باب - ۴

اگلی شام یوسف محمد سعید کا مہمان تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ سیر کے ارادے
سے باہر نکلا تو نسرین بھاگتی ہوئی اُس کے قریب آگئی:

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

یوسف نے کہا: "شہزادی صاحبہ! مَیں تو سیر کے لیے جا رہا ہوں ——
آپ بھی میرے ساتھ چلیں — شہزادیوں کے لیے سیر بہت ضروری ہوتی
ہے"۔ اِس طرح اُس نے اپنا ہاتھ نسرین کی طرف بڑھا دیا۔

اور وہ اِس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چل پڑی۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے پوچھا
بھائی جان یہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟

یوسف نے غور سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شہزادی وہ ہوتی ہے جس کے بال سنہری ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں تاروں کی
طرح چمکتی ہوں۔ پیشانی کشادہ ہو۔ کوئی آواز دے تو بے پروائی سے منہ پھیر لے۔
کوئی ہنس پڑے تو وہ تلملا کر جلاّد سے کہے:
جلاّد! اِس گستاخ کی گردن مار دو اور جسے سب پیار کرتے ہوں، لیکن
اُسے کسی کی پروا نہ ہو"۔

نسرین نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ کر بولی۔

"واہ جی! آپ کا مطلب ہے کہ شہزادی بڑی اُلّو ہوتی ہے ——

ایکدم اُلّو! اور بدتمیز اور بے وقوف بھی!"

یوسف ہنس پڑا۔ "نہیں نسرین! مَیں مذاق کر رہا تھا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے
تھا کہ شہزادی بالکل نسرین جیسی ہوتی ہے۔ اِسی لیے تو مَیں نے تمہیں دیکھتے ہی
شہزادی نسرین کہا تھا"۔

"اور آپ نے مجھ میں کون سی بے وقوفی کی بات دیکھی تھی"۔

"یہ کس نے کہا ہے کہ شہزادی نسرین بے وقوف ہے"۔

"آپ کا مطلب تو یہی تھا!"

"بالکل نہیں!"

"میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی کبھی کبھی چھوٹی سی بات پر روٹھ
جایا کرتی ہے"۔

"آپ سے کب روٹھی تھی میں؟"

"اِتنی جلدی آپ کیسے روٹھ سکتی ہیں؟"

"میں بہت دیر کے بعد بھی آپ سے نہیں روٹھوں گی"۔

یوسف نے کہا۔ "نہیں! آپ کو یہ کہنا چاہیے کہ آپ کبھی کبھی رُوٹھا
کریں گی! شہزادیاں اگر روٹھنا بھول جائیں تو وہ شہزادیاں نہیں رہتیں اور میں
ننھی نسرین کو ہمیشہ ایک شہزادی دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"نانی جان کہتی تھیں کہ کسی اور نے مجھے شہزادی نہیں کہا!"

یوسف بولا: "شہزادی کو پہچاننے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ ایک
بے وقوف آدمی شیشے کے ٹکڑے اور ہیرے میں امتیاز نہیں کر سکتا"۔

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ کے سوا سب بے وقوف ہیں"۔

"نہیں! میرا مطلب یہ نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی نے آپ کو غور سے دیکھا ہی نہیں۔"

"نانی جان بھی سب سے یہی کہتی ہیں کہ میری بیٹی کو غور سے دیکھو!"

"وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب ہمیں باتیں کرنے کی بجائے ذرا تیز تیز چلنا چاہیے! خاموشی سے تیز چلنا بھی شہزادیوں کے لیے بہت ضروری ہے۔"

یوسف لمبے لمبے قدم تیزی سے اٹھا رہا تھا اور نسرین اُس کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد وہ رُک گئی۔ یوسف نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے شہزادی؟"

نسرین بولی "میں نہیں بنتی شہزادی، اب واپس چلیں۔"

یوسف واپس چل دیا۔ اور نسرین نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

یوسف بولا "اب اگر شہزادی صاحبہ چاہیں تو بہت آہستہ چل سکتی ہیں اور باتیں بھی کر سکتی ہیں۔"

"بھائی جان!" نسرین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا:

"یہ ناول کیا ہوتا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا: "اِس کا اصل مفہوم تو تم اس وقت سمجھ سکو گی جب بڑی ہو جاؤ گی اور چند اچھے ناول پڑھ لو گی۔ اس وقت میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ ناول ایک طرح کی کہانی ہوتی ہے جس میں کئی پہلوؤں سے زندگی کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہانی تھی کہ دو آدمی جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا مختلف سمتوں سے کوہ مردار کی چوٹی پر جا رہے تھے۔ پھر راستے میں بھیڑیے آ گئے اور وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ پھر ان کی دوستی چند خاندانوں تک پہنچ

گئی اور نئے واقعات پیش آتے اور نئے کردار شامل کرنے سے یہ کہانی پھیل کر ایک ناول بن گئی۔"

"بھائی جان! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن میں کچھ نہیں سمجھی۔"

وہ دونوں گھر پہنچے تو صحن میں محمد سعید کی بیوی اور بیٹیاں اور نانی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر نسرین کی نانی نے آواز دی:

"بیٹا! ادھر ہی آ کر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں!"

پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی:

بیٹی! اپنے بھائی کے لیے ایک کرسی میرے پاس رکھ دو۔

یوسف آہستہ سے السلام علیکم کہہ کر بیگم احمد کے پاس بیٹھ گیا تو اُس نے کہا:

"بیٹا! ابھی احمد خان صاحب جو تمہارے میزبان تھے، آئے تھے اور ایک لفافہ دے گئے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ وہ تمہیں گاڑی پر رخصت کرنے آئیں گے لیکن ہم نے انہیں یہ کہہ دیا تھا کہ ہم نے ابھی سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اب ہم کل کی بجائے پرسوں جائیں گے۔

بات یہ ہوئی تھی کہ جب تم دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے میزبان کے ساتھ گئے تھے تو اسماء اس کی بہن اور پڑوس میں اُس کی چند سہیلیوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ ہم نے اِس شرط پر ایک پڑوسی کی طرف سے دوپہر کا کھانا کھانے کی دعوت قبول کی تھی۔ کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔"

یوسف نے کہا: "ہاں جی! اگر آپ نے کسی کی دعوت قبول کی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"بیٹا! شہزادی نسرین کو ہم سب نے منع کیا تھا اور اسے اس بات کا احساس
دلایا تھا کہ اگر اس کے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو آپ کسی صورت میں یہاں
نہیں رُکیں گے ۔ اور بیٹا خان صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری کچھ چیزیں
تمہیں ریل گاڑی پر پہنچا دی جائیں اور یہ بھی تاکید کی تھی کہ تم اپنا ٹکٹ نہ لو۔"

یوسف نے کہا "ماں جی! یہ ان کی بہت زیادتی ہو گی ۔ انہیں مہمان نوازی
کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ میں ان سے کوئی چیز نہیں لوں گا۔"

بیگم احمد نے کہا۔ "بیٹا! تمہیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ تمہارے طرز عمل
سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔"

"نہیں، ماں جی! ایسا نہیں ہو گا۔"

بیگم احمد نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"یہاں ہمارے جاننے والوں میں کل سے بھیڑیوں کے واقعہ کے بعد زیادہ
شہرت ہماری شہزادی کو ملی ہے ۔ اور اسے تحائف بھی موصول ہو چکے ہیں۔ کل
ہنا وادی میں ہماری پکنک اور پر تکلف دعوت ہے ۔

نسرین بیٹی! وہ لفافہ اگر تم نے گم نہیں کر دیا تو جب یہ اندر جائیں۔ انہیں
دے دو!"

تھوڑی دیر بعد یوسف بیٹھک کے اندر گیا۔ نسرین نے لفافہ لا کر اس کے
ہاتھ میں دے دیا۔ یوسف نے لفافہ کھولا اندر سو سو کے دو نوٹ تھے اور ایک
کاغذ پر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی:

بھائی یوسف صاحب! السلام علیکم: یہ بڑے بھائی کی طرف سے اپنے
چھوٹے بھائی کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے اگر قبول کر لو تو مجھے خوشی ہو گی ۔ اگر
قبول نہیں کرو گے تو مجھے صدمہ ہو گا۔ کہیں یہ نہ لکھ دینا کہ مجھے ضرورت نہیں ۔ اگر

ضرورت نہ ہو تو بھی یہ پیسے اپنے پاس رکھ لینا ۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ
سے یہ چند روپے کسی بہتر جگہ خرچ ہوں گے ۔ میں ریلوے سٹیشن پر تم سے ملوں گا،
لیکن اس سے پہلے مجھے یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ ان پیسوں کے متعلق کوئی بات نہیں
ہو گی ۔ اور مجھے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔

تمہارا بھائی احمد خان

رات کھانا کھانے کے بعد یوسف نے عشاء کی نماز ادا کی اور اس کے بعد
اپنے ہینڈ بیگ سے بڑے سائز کی ایک نوٹ بک نکالی اور میز کے سامنے بیٹھ کر
لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ گھر کے باقی افراد سو چکے تھے۔

نسرین اور اسماء دبے پاؤں اُس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اُسے
منہمک دیکھ کر کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑی رہیں پھر وہ واپس جانے لگیں تو اس
نے اچانک دیکھ کر کہا۔

"ارے! شہزادی نسرین تم جاگ رہی ہو؟"

"آپا اسماء کا خیال تھا کہ آپ ہمیں کوئی بہت اچھی کہانی سنائیں گے لیکن
آپ مصروف ہیں۔"

یوسف مسکرایا: "اس وقت کچھ لکھ رہا ہوں اس کے متعلق اس وقت
میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب بڑی ہو کر تم پڑھو گی تو تمہیں پسند آئے گا۔ ہو سکتا ہے
کہ کچھ عرصہ بعد یہ میرے کسی ناول کا اہم حصہ بن جائے۔ لیکن یہ ہے بہت اہم۔ اب تم
کو اس کی رکھوالی کرنی پڑے گی اور اس کے بعد سفر کے دوران اس کی حفاظت کی
ذمہ داری میں شہزادی نسرین کو سونپتا ہوں۔ لیکن ابھی کسی کو پڑھنے کی اجازت
نہیں ہے ۔ اب تم دونوں یہ وعدہ کرو کہ کسی سے اس کاپی کا ذکر نہیں کرو گی اور نہ ہی

اسے کھول کر پڑھو گی۔"

اسماء نے بھولے پن سے کہا۔" جی میں وعدہ کرتی ہوں اور نسرین تو شاید سمجھ بھی نہ سکے کہ آپ کیا لکھ رہے ہیں"۔ نسرین نے تلملا کر کہا۔

" واہ جی ! میں کوئی نالائق ہوں۔ ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل آتی ہوں۔"

یوسف نے کہا۔" اچھا شہزادی صاحبہ ! اب جا کر آرام کریں۔ میں سونے سے پہلے چند صفحات اور لکھ لوں۔"

وہ چلی گئیں اور یوسف لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

بیگم فریدہ احمد تہجد کی نماز کے لیے اُٹھیں تو یوسف کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اُدھر آ گئیں :

"بیٹا ! تم رات سوئے نہیں ؟"

" ماں جی !" یوسف نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔" اب تہجد پڑھ کر ہی سوؤں گا۔"

بیگم احمد نے پوچھا،" بیٹا ! کیا تم ساری رات لکھتے رہے ہو ؟"

" ہاں ماں جی ! آج لکھنے کا موڈ تھا۔ اور جب موڈ بن جاتا ہے تو مجھے رات کا احساس نہیں رہتا۔ مجھے نیند یا تھکاوٹ بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

" بیٹا ! تم کیا لکھ رہے ہو؟"

" ماں جی ! میں نے اپنے گاؤں پر ایک مضمون لکھا تھا جو ہمارے انگریزی کے پروفیسر کو بہت پسند آیا اور انہوں نے مجھے کہا کہ یہ مضمون ذرا تفصیل سے لکھ ڈالو ! اب میں اِسے تفصیل سے لکھ رہا ہوں اور اس میں بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں جو اس کی ابتداء کرتے وقت میرے ذہن میں نہ تھیں۔ مثلاً۔ میری اپنی زندگی کے کئی واقعات اس میں شامل ہوتے جا رہے

ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ علیحدہ کتاب کی صورت میں یا کسی کتاب کے حصے کے طور پر شائع ہوں گے تو آپ انہیں پسند فرمائیں گی۔"

بیگم احمد نے کہا: بیٹا ! مجھے یقین ہے۔ کہ جو کچھ تم لکھو گے۔ مجھے پسند آئے گا۔ اب اٹھ کر تہجد پڑھ لو۔ اس کے بعد نماز فجر کا وقت ہو جاتے گا اور ایسے کاموں کے لیے زندگی پڑی ہے۔

یوسف نے قلم رکھ دیا اور اُٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

وضو کے بعد واپس آ کر یوسف نے اپنے بیگ سے جائے نماز نکالی اور صحن میں چلا گیا۔ وہاں نمازِ تہجد ادا کرنے کے بعد اُس نے بنگلے سے باہر کچھ دُور ٹہلنے کے بعد صبح کی نماز ادا کی۔ تازہ ہوا میں چند لمبے لمبے سانس لئے اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

برآمدے میں بیگم احمد، سعید کی بیوی ، اسماء، اور نسرین نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگ رہی تھیں۔

یوسف نے بیگم احمد کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

" ماں جی !" میرے لیے بھی دُعا کریں۔"

کمرے میں پہنچتے ہی وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور چند ثانیے کے بعد گہری نیند سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو نسرین کرسی پر اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

" میرا خیال ہے کہ میں بہت سویا ہوں" اُس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

" جی ہاں" نسرین کی آواز آئی۔

" نانی جان کے حکم سے پہرہ دے رہی ہوں کہ آپ کو کوئی جگا نہ دے۔ میں اتنی دیر سوتی تو میری پٹائی کر ڈالتیں۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نسرین شہزادی! جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو نانی جان کی پٹائی کو بھی اپنی زندگی کے انعامات میں شمار کیا کرو گی"۔

"ماں جی!" وہ بیگم احمد کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:

میں ابھی نہا کر آتا ہوں"۔

"بیٹا! جلدی کرو۔ میں تمہارا ناشتہ بناتی ہوں۔ وہ سب کب سے سیر کو جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں"۔

"ماں جی! آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا"۔

"نہیں بیٹا! تمہاری نیند اِن کی سیر سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں نے تو یہ کوشش کی تھی کہ چلنے کا پروگرام ہی منسوخ کر دیا جائے لیکن یہاں ایک اچھی خاصی دعوت کا انتظام ہو چکا ہے"۔

یوسف نے کہا۔ "ماں جی! اگر یہ دعوت منسوخ ہو جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ مَیں اِتنے دن کبھی اپنی والدہ سے دُور نہیں رہا۔ یہ عجب بات ہے کہ آپ کو مَیں نے پہلی نظر دیکھ کر محسوس کیا ہے کہ شاید امی جان یہاں آگئی ہیں اور مجھے آپ کو "ماں جی" کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے"۔

بیگم احمد نے کہا۔ "بیٹا! تمہارے منہ سے ماں جی کا لفظ سُن کر مجھے بھی بہت خوشی ہوتی ہے۔ اب جا کر ناشتے کی تیاری کر لو۔ ناشتے کے بعد تمہیں چند گھنٹے اور آرام کرنا چاہیے۔ اُس کے بعد ہم بہت سی باتیں کریں گے"۔

باب - ۵

تیسرے دن جب وہ اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہے تھے، احمد خاں کا ڈرائیور کار لے کر آگیا۔ اُس نے ایک ٹوکری اور ایک چھوٹا سا پیکٹ یوسف کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اسے اپنے سامان کے ساتھ رکھوا لیجیے۔ خان صاحب کا حکم ہے کہ مَیں آپ کو اسٹیشن تک پہنچا دوں۔ وہ گاڑی روانہ ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے"۔

یوسف نے کہا۔ "میں یہ پیکٹ اپنے سامان میں رکھ لیتا ہوں اور خشک پھل والی اس ٹوکری کو کار میں ہی رہنے دو۔ مَیں باقی سامان بھی پہنچا دیتا ہوں"۔

یوسف نے اندر جا کر پیکٹ کھولا اور قراقلی کی ایک خوب صورت ٹوپی نکال کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی۔



تھوڑی دیر بعد یوسف، بیگم احمد اور نسرین کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ جب گاڑی لگ گئی تو انہوں نے انٹر کلاس کے ایک ڈبے میں سامان رکھنے اور اوپر کی سیٹوں پر بستر لگانے کے بعد بیگم احمد کو اندر بٹھا دیا۔ محمد صدیق نے تازہ پانی کی صراحی بھر کر رکھ دی اور باہر نکل کر گاڑی دیکھنے لگا: "معلوم ہوتا ہے کہ بھائی جان کسی اہم کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ورنہ اب تک وہ ضرور آجاتے"۔

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی گاڑی روانہ ہونے میں بہت وقت ہے۔ دیکھئے! شاید خان صاحب آرہے ہیں۔"

محمد سعید نے پھاٹک کی طرف دیکھا تو احمد خان دکھائی دیتے۔ وہ دونوں پھاٹک کی طرف بڑھے اور نسرین اُن کے پیچھے بھاگنے لگی۔

یوسف نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔"خان صاحب! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک مدت آپ کے پاس رہا ہوں اور مدت تک آپ کا مقروض رہوں گا۔"

احمد خان نے کہا۔"یار! کیا بات کرتے ہو۔ اگر بڑا بھائی ایک فرض پورا کرے تو چھوٹے بھائی کو شکریہ ادا کرکے اسے پریشان نہیں کرنا چاہیے۔"

یوسف نے مڑکر نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے! تمہیں گاڑی کے اندر بیٹھنا چاہیے تھا۔" خان صاحب! یہ وہ شہزادی ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔"

محمد سعید، پھاٹک سے اندر آگیا اور اُس نے بیگم احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھے شکار پور اور سکھر، ٹیلی فون کرتے ہوئے کچھ دیر ہوگئی۔ ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ سندھ کے بند میں کسی جگہ شگاف پڑگیا ہے۔ اگرچہ اُسے بند کرنے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن اگر شگاف بند نہ ہو سکا۔ تو بند ٹوٹ جانے سے ایک وسیع علاقے میں سیلاب آجائے گا اور کئی دیہات ڈوب جائیں گے۔ یہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سکھر اور شکار پور کے درمیان ریلوے لائنیں اور سڑکوں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے میں نے احتیاطاً شکار پور اور سکھر اپنے جاننے والوں کو ٹیلی فون کر دیا ہے۔ شکار پور کا اسٹیشن ماسٹر اور سکھر میں ریلوے پولیس کا انسپکٹر میرے دوست

ہیں اور انہوں نے مجھے تسلی دی ہے کہ خدانخواستہ اگر کوئی خطرناک صورت حال پیش آگئی تو وہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اگر آپ یہ دیکھیں کہ شکار پور سے آگے سڑک بند ہے تو بہتر یہی ہوگا کہ آپ فوراً واپس کوئٹہ آجائیں۔ میں ان لوگوں سے رابطہ رکھوں گا۔ اور یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ یوسف جیسا نوجوان آپ کا ساتھی ہوگا۔"

احمد خان نے کہا۔" اگر ایسی بات ہے تو یہ لوگ رُک کیوں نہیں جاتے۔"

"نہیں خان صاحب! یوسف بولا: اگر میرے ساتھی رُکنا چاہیں تو یہ اور بات ہے ورنہ میرا واپس جانے کا فیصلہ اٹل ہے۔ اگر سیلاب کی وجہ سے کسی جگہ ریل گاڑیاں اور موٹریں بند بھی ہو جائیں تو وہاں کشتیاں کام آئیں گی۔ اور مجھے کشتی پر سفر کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں کشتی کھینا بھی جانتا ہوں اور بوقتِ ضرورت تیر بھی سکتا ہوں۔"

احمد خان نے کہا۔"میرے بھائی کوئی ایسا بھی کام ہے جو آپ نہیں جانتے؟"

"خان صاحب! بعض کام سب کو آنے چاہئیں اور تیرنا ان میں سے انتہائی اہم ہے۔"

بھئی! میں تیرنا چاہتا ہوں۔ ایک اچھا تیراک بننے میں کتنی دیر لگے گی؟"

یوسف نے کہا۔"خان صاحب! انسان فطری طور پر تیراک ہے مجھے یقین ہے کہ چند ماہ کا بچہ بھی تیراک بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اُس میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔"

محمد صدیق نے پوچھا۔" یوسف! آپ نے کس عمر میں تیرنا سیکھا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں کہ میں کب سے تیرنا جانتا تھا۔ لیکن یہ بات مجھے

اُس وقت معلوم ہُوئی جب میرے چچا جان نے گہرے پانی میں مجھے دھکا دے دیا اور میں ایک غوطا کھانے کے بعد تیرنے لگ گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے میں —— اور میری عمر کے دوسرے لڑکے کمر برابر پانی سے آگے جانا پسند نہیں کرتے تھے۔"

محمد صدیق نے کہا: "اب گاڑی چلنے کا وقت ہو چکا ہے"! اور وُہ گاڑی کی طرف چل دیے۔

نسرین کو محمد سعید اور محمد صدیق نے یکے بعد دیگرے پیار کیا اور وہ گاڑی کے اندر جا بیٹھی۔ یوسف نے سب کے ساتھ مصافحہ کیا اور ٹرین پر سوار ہو گیا۔

ریل گاڑی کے ڈبے میں پانچ بڑی سواریاں تھیں، جن میں دو مرد، تین عورتیں اور انکے علاوہ ایک بچہ بھی تھا، یوسف بیگم فریدہ احمد اور نسرین دونوں سے ذرا ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا گاڑی چلنے سے تھوڑی دیر بعد بیگم فریدہ احمد نے کہا" خدا کا شکر ہے کہ یہ ڈبہ خالی جا رہا ہے۔ جب میں آئی تھی، تو بہت زیادہ رش تھا۔"

یوسف بولا" ماں جی! ان دنوں مسافروں سے بھری ہوئی گاڑیاں یہاں آتی ہیں اور قریباً خالی واپس جاتی ہیں۔ جب گرمی گذر جائے گی تو حساب اُلٹا ہو جائے گا۔"

مسز احمد نے کہا" بیٹا! تم ذرا قریب آجاؤ۔ مجھے گاڑی کے شور میں باتیں کرتے ہوئے اُلجھن محسوس ہوتی ہے، نسرین بیٹی! اپنے بھائی کو جگہ دے دو۔"

نسرین سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی اور یوسف بیگم احمد کے قریب ہو گیا وُہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔

بستی تک پہنچنے سے پہلے مسز احمد، یوسف کے والدین، اُس کے بہن بھائیوں، چچاؤں اور اُن کے بیٹوں بیٹیوں کے متعلق بہت کچھ جان چکی تھیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وُہ بچلے متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اُس کا والد ایک تحصیلدار ہے۔ اُس نے اپنے متعلق یوسف کو یہ بتایا تھا کہ وہ لدھیانے کے ایک ایسے

تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کے بعض افراد سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور نسرین کے والد کا جالندھر میں کاروبار بھی ہے اور شہر سے چند میل دُور وہ اپنی اور اپنے بھائیوں کے حصے کی زمین کا انتظام بھی کرتا ہے۔

بستی میں انہوں نے چائے پی اور جب یوسف بیرے کو بل دینے لگا تو بیگم احمد نے کہا: "یوسف بیٹا! یہ پیسے اپنی جیب میں رکھو۔ —— مَیں یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ تم میرے بیٹے کے سوا کچھ اور ہو۔"

یوسف بولا: "ماں جی! اگر آپ ناراض ہوتی ہیں تو مَیں معافی مانگتا ہوں۔"

"مائیں بیٹوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتیں۔ لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ سفر کے دوران تم کوئی چیز بھی اپنی جیب سے نہیں خریدو گے۔ اب ایک اچھے بیٹے کی طرح وعدہ کرو کہ مجھ کو یہ بات دوبارہ نہیں کہنی پڑے گی۔"

"ماں جی! اگر آپ اس بات پر خوش ہو سکتی ہیں، تو مَیں وعدہ کرتا ہوں۔"

بیگم احمد نے بیرے کو بل ادا کرنے کے بعد قدرے توقف کے بعد کہا۔

"بیٹا! تمہاری امی جان تم سے بہت پیار کرتی ہوں گی؟"

"جی ہاں!"

"تمہارا اُٹھنا بیٹھنا اور بولنا ہمیں بھی بہت اچھا لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جب تم سو جاتے ہو گے تو وہ ٹکٹکی باندھے تمہارا چہرہ دیکھتی رہتی ہوں گی۔"

یوسف مسکرایا۔ "ماں جی! مجھے یہ یاد ہے کہ جب مَیں چھوٹا تھا تو بستر پر لیٹ کر اُن کا انتظار کیا کرتا تھا اور جب وہ کمرے کی طرف آتی تھیں تو مَیں اپنی آنکھیں بند کر کے یہ ظاہر کیا کرتا تھا کہ مَیں سو رہا ہوں۔ وہ میرا ماتھا چوما کرتی تھیں اور میرے لیے دعائیں کیا کرتی تھیں۔"

بیگم احمد نے کہا! "بیٹا تمہاری ماں بہت خوش قسمت ہے! کل جب تم

ساری رات جاگنے کے بعد سو رہے تھے تو مَیں یہ سوچ کر تمہارے پاس بیٹھی رہی کہ کوئی تمہیں جگا نہ دے پھر ذرا غور سے تمہارا چہرہ دیکھا تو میری نگاہیں تمہاری پیشانی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ مَیں نے تمہارے ماتھے پہ ہاتھ پھیرا تھا لیکن تم گہری نیند سو رہے تھے۔ بیٹا! تمہیں وہ بہت یاد آتی ہوں گی"۔

"جی ہاں بہت زیادہ! ہو سکتا ہے آپ کو میری اس بات پر یقین نہ آئے: اگر امی جان اچانک اس گاڑی میں آجائیں تو شاید نسرین بھی بدحواس ہو کر کہے کہ یہ دوسری نانی اماں کہاں سے آگئی ہیں؟"

"انشاءاللہ میں انہیں ضرور ملوں گی۔ میں انہیں لدھیانے آنے کی دعوت دُوں گی اور تُم سے یہ وعدہ لُوں گی کہ تم اُنہیں لے کر آؤ گے"۔ بیگم احمد نے کہا۔

نسرین بولی: "نانی جان! دعوت میری امی جان کی طرف سے ہو گی اور آپ سب جالندھر آئیں گے۔ جالندھر پہلے آتا ہے اور لدھیانہ بعد میں! اس لیے جب ان کی امی آئیں گی تو ہم آپ کو بھی جالندھر بُلا لیں گے"۔

"ٹھیک ہے بیٹی! شاید تمہارے بھائی یوسف بھی یہ پسند نہ کریں کہ کوئی شہزادی کو سلام کیے بغیر آگے چلا جائے۔ کیوں یوسف"؟

"آپ درست فرماتی ہیں! ہم گھر سے روانہ ہونے سے پہلے آپ کو لکھ دیں گے کہ ہم فلاں تاریخ کو جالندھر پہنچ جائیں گے اور اس کے بعد باقی پروگرام آپ کے حکم کے مطابق طے ہو گا۔ لیکن میں ایک بات سے ڈرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ لدھیانہ میں ہوئیں اور ہم جالندھر پہنچ گئے اور وہاں جا کر ہم نے شہزادی صاحبہ کے گھر دستک دی اور شہزادی صاحبہ نے باہر نکل کر یہ پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور یہاں تمہارا کیا کام ہے؟ تو ہم انہیں اُس وقت کیا جواب دیں گے؟"

"واہ جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔ نسرین نے کہا۔

"شہزادیاں اکثر بھول جایا کرتی ہیں"۔

نسرین بولی۔ "آپ اگر کئی سال کے بعد بھی وہاں آئیں تو مَیں آپ کو دُور سے دیکھ کر پہچان لُوں گی"۔

یوسف نے کہا! "آپ کو معلوم نہیں کہ عمر کے ساتھ شکلیں بھی بدل جایا کرتی ہیں"۔

"ہرگز نہیں! آپ کی شکل اتنی نہیں بدل سکتی کہ مَیں پہچان نہ سکوں اور اگر بدل بھی جائے تو آپ کی ایک نشانی میں کبھی نہیں بھولوں گی"۔

بیگم احمد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹی، وہ کیا ہے"۔

"نانی جان! ان کے ماتھے پہ آنکھ کے اوپر زخم کا داغ ہے"۔



جیکب آباد کے اسٹیشن پر وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ سٹیشن ماسٹر کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے پُوچھا۔ یہاں بیگم فریدہ احمد کون ہیں؟

"مَیں ہوں"۔ بیگم فریدہ احمد نے جواب دیا۔

"جناب! مجھے روہڑی کے ریلوے پولیس انسپکٹر اور شکار پور کے سٹیشن ماسٹر کا ابھی ابھی فون آیا ہے کہ دریا کے بند کا جو حصہ ٹوٹ چکا ہے اِس کا مرمت ہونا ناممکن ہے۔ سکھر اور شکار پور کے درمیان قریباً سولہ میل کے علاقے میں بڑی تیزی سے پانی بہہ رہا ہے ریلوے لائن بھی ٹوٹ گئی ہے اور سڑک کئی کئی فٹ پانی میں ڈوب گئی ہے!

اسٹیشن ماسٹر نے شکار پور میں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا ہے اور سرکاری اطلاع یہ ہے کہ ایک دو دن تک کشتیوں کے ذریعے آمد و رفت شروع ہو جائے گی اگر آپ سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کریں تو اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ پہلے دن ہی آپ کو روانہ کر دیا جائے۔ لیکن اگر آپ کوئٹہ واپس جانے کا فیصلہ کر لیں تو بہتر یہ ہو گا کہ آپ جیکب آباد سے ہی پہلی گاڑی پر واپس تشریف لے جائیں"۔

بیگم احمد نے پوچھا۔"اگر میں کوئٹہ واپس چلی جاؤں تو تمہارے خیال میں کتنی دیر تک ریلوے لائن یا سڑک سفر کے قابل ہو جائے گی؟"

"بیگم صاحبہ! اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کام ہفتوں بلکہ مہینوں کا بھی ہو سکتا ہے۔"

بیگم احمد نے کہا۔"اگر دو چار ہفتے بعد بھی ہمیں کشتی پر ہی سفر کرنا ہے تو ہم کوئٹہ واپس کیوں جائیں؟ میں ایک دو دن کے لیے شکارپور کی گرمی برداشت کر لوں گی —— کیوں بیٹا یوسف، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ماں جی! آپ کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ میں ہر صورت میں گھر جانا چاہتا ہوں! اگر آپ کوئٹہ لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیتی ہیں تو بھی میں آپ کو وہاں پہنچا کر اگلی گاڑی پر شکارپور کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ جس علاقے میں سیلاب آیا ہے میں نے کار پر کوئٹہ جاتے ہوئے یہ علاقہ دیکھا ہے آپ کو گرمی سے تکلیف ہو گی اور آپ یہ محسوس کریں گی کہ جنگلوں میں سے گذر رہی ہیں۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا۔"بابو صاحب! آپ شکارپور ٹیلی فون کر دیں کہ ہم کشتیاں روانہ ہونے تک اُن کے پاس ٹھہریں گے اور یہ بھی کہہ دیں کہ اس وقت ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ شاید ہمارے متعلق سکھر اور کوئٹہ سے بھی آپ کو فون آئیں۔ مہربانی فرما کر آپ سب کو ہمارے فیصلے کی اطلاع دے دیجیے۔"



رات کے وقت وہ شکارپور کے سٹیشن ماسٹر کے مکان کی چھت پر آرام کر رہے تھے۔ ہوا خلافِ معمول خوشگوار تھی اور وہ جلد ہی گہری نیند سو گئے۔

صبح نسرین کو اُس کی نانی جان نے جھنجوڑ کر جگایا: "بیٹی! اُٹھو! نماز کا وقت

جا رہا ہے۔" نسرین نے آنکھیں کھول کر یوسف کی کھاٹ خالی دیکھی تو نانی سے پوچھا۔

"وہ کہاں ہیں نانی جان؟"

"بیٹی! وہ بہت سویرے نماز کے لیے نکل گیا تھا اور اپنا تھیلا اُٹھا کر اُس نے تمہارے سرہانے رکھ دیا تھا اور یہ کہہ گیا تھا کہ اس تھیلے کے اندر کوئی بہت اہم چیز ہے۔ اس لیے جب نسرین بیدار ہو، اُسے تاکید کر دیں کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ نماز کے بعد وہ سیر کے لیے جائے گا اور وہ مقام دیکھ کر آئے گا جہاں تک سیلاب کا پانی پہنچ چکا ہے اور یہ بھی پوچھ کر آئے گا کہ ہمیں کشتی کس جگہ سے ملے گی؟"

نسرین وضو کرنے کے بعد نماز کے لیے کھڑی ہونے لگی تو بیگم احمد نے کہا: "بیٹی! نماز پڑھ کر نیچے آ جانا۔"

نسرین نے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو روزمرہ کی دعا کے ساتھ اُس کی زبان پر چند نئی باتیں آ گئیں۔ وہ کہہ رہی تھی:

"یا اللہ! اس خوفناک سیلاب میں سے گذرتے ہوئے ہمیں ہر مصیبت سے بچائیو۔
یا اللہ! گرمی لگنے سے نانی جان کی صحت خراب نہ ہو۔ جس کشتی پر ہم سوار ہوں۔
اُس کی حفاظت کیجیو اور مگرمچھوں اور پانی کی دوسری بلاؤں کو ہم سے دور رکھیو۔
یا اللہ بھائی یوسف بھی خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائیں۔"

میزبان کی بیوی اوپر آئی اور اس نے کہا۔"بیٹی نیچے آؤ ہم سب ناشتے کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

نیچے کشادہ کمرے میں میزبان کی بیٹیاں اور دو بیٹے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ نسرین نے اپنی نانی سے سوال کیا۔"نانی جان! بھائی یوسف ابھی تک نہیں آئے؟"

"بیٹی! تم اطمینان سے ناشتہ کرو۔ جب وہ آئے گا تو اس کی تواضع تمہاری خواہش کے عین مطابق کی جائے گی۔"

نسرین نے اچانک اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "نانی جان! میں ابھی آتی ہوں۔" وہ بھاگتی ہوئی زینے کی طرف بڑھی اور پھر چند ثانیے بعد وہ اُسی طرح بھاگتی ہوئی واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں وہ بیگ تھا جو یوسف اس کے سرہانے چھوڑ گیا تھا:

"نانی جان! میں یہ بھول گئی تھی اور بھول جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں نماز پڑھتے ہی نیچے آگئی تھی۔"

میزبان کی بیوی نے پوچھا۔ "کیا اس تھیلے میں کوئی خاص چیز ہے بیٹی!"

"جی اس میں یوسف بھائی کی چیزیں ہیں جن کے متعلق وہ کہتے تھے کہ میں ان کی حفاظت کروں۔"

دُھوپ کافی تیز ہو چکی تھی: یوسف واپس آیا تو نسرین پریشانی کی حالت میں دروازے کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔

وُہ صحن میں داخل ہوا تو نسرین ایک کمرے کی طرف بھاگی۔

"نانی جان! وہ آگئے ہیں" پھر وہ مڑ کر یوسف کی طرف متوجہ ہوئی جو تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔

"آئیے نا، یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔ نانی جان آپ کا انتظار کر رہی ہیں، گھر کے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہت پریشان تھے وُہ!"

یوسف مسکراتا ہوا داخل ہوا اور اُس نے کہا۔ "ماں جی! وہ جگہ جہاں کشتیاں پہنچنا شروع ہو گئی ہیں یہاں سے کافی دور ہے۔ میں ہر بات کا پتہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ تاکہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ انشاء اللہ! کل ہمیں کشتی مل جائے گی۔

گرمی بہت ہوگی۔ لیکن ہماری کوشش یہی ہونا چاہیے کہ ہم روانگی میں دیر نہ لگائیں۔ یہاں سے کشتی تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی چار میل تانگے پر سفر کرنا پڑے گا۔ اس میں سے آخری چار فرلانگ کہیں گھٹنے گھٹنے اور کہیں اس سے بھی زیادہ پانی میں سے گذرنا پڑے گا۔

آپ کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے کوئی اچھا تانگہ تلاش کر لیا جائے۔"

"ہاں بیٹا! اس مصیبت سے بچنے کے لیے میں تانگے والے کو پانچ روپے انعام بھی دے دوں گی۔"

یوسف نے کہا۔ "ماں جی! میں پہلے یہ دیکھوں گا کہ گھوڑا پانی سے نہ ڈرتا ہو۔ پھر پانچ روپے انعام کے لالچ میں تانگے والا آپ کو بالکل کشتی کے قریب پہنچا دے گا۔"

"ہاں بیٹا! گھوڑا ضرور دیکھ لینا، انعام ہم زیادہ بھی دے سکتے ہیں۔ نسرین اس بات سے بہت ڈرتی ہے کہ پانی میں مگرمچھ اسے پکڑ لیں گے!"

نسرین نے پریشان ہو کر کہا۔ "نانی جان! مجھے یہ بتائیں کہ مگرمچھوں سے کون نہیں ڈرتا اور دریائے سندھ کے مگرمچھ تو اور بھی زیادہ خوفناک ہوتے ہوں گے۔ کیوں بھائی جان! آپ نے جس جگہ سیلاب کا پانی دیکھا تھا وہاں مگرمچھ تو نہیں تھے؟"

یوسف بولا: "دیکھو نسرین! دریا میں مگرمچھ تو ہوتے ہیں لیکن وہ اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ جس طرف سیلاب رُخ کرے اُدھر ہی چل پڑیں۔ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ سیلاب کا پانی اُتر جائے گا وہاں وہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے جس طرح ہم اپنا شہر یا گاؤں چھوڑنا پسند نہیں کرتے اس طرح مگرمچھ بھی اپنی مستقل رہائش گاہوں سے دُور نکل جانا پسند نہیں کرتے، لیکن یہ سیلاب چونکہ ایسا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا نے اپنا رُخ ہی بدل دیا ہے تو بعض مگرمچھ ایسے بے وقوف ہو سکتے ہیں کہ وہ اس طرف آنکلیں، لیکن آپ کو ان سے نہیں ڈرنا چاہیے۔

نانی جان نے کہا! "اچھا بیٹی جاؤ۔ ان کے ناشتے کی فکر کرو۔ پھر مگرمچھوں کی باتیں کرنا۔"

میزبان کی بیوی نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا: "بی بی جی ناشتہ تیار ہے۔ بیٹیں

یہیں لے آتی ہوں"۔ تھوڑی دیر بعد یوسف اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا اور نسرین بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ پوچھ رہی تھی کہ "بھائی جان! اُن بے وقوف مگرمچھوں میں سے کوئی مجھے تو نہیں پکڑے گا"۔

یوسف نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف! خواہ انسان ہو یا مگرمچھ اُس پر کبھی اعتماد تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ کئی میلوں میں پھیل جانے کی وجہ سے دریا کے پانی کی گہرائی اِتنی کم ہو گئی ہے کہ انتہائی بے وقوف بلکہ پاگل مگرمچھ بھی اِس طرف نہیں آئے گا"۔

بھائی جان! جو مگرمچھ بے وقوف ہو سکتے ہیں اور پاگل بھی تو پھر وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہوں گے؟

یوسف نے جواب دیا: "مگرمچھ صرف مگرمچھ ہوتا ہے اور یہ اس کی عادت ہے کہ وہ دریا کے اصل راستے سے دُور جانا پسند نہیں کرتا۔ راوی اور بیاس دونوں ہم سے قریب ہیں اور جب ان میں سے کسی دریا میں بھی سیلاب آتا ہے تو میلوں تک پانی پھیل جاتا ہے لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں سُنا کہ دوسری مچھلیوں کی طرح مگرمچھ بھی دریا سے نکل کر کھیتوں میں آگئے ہوں اور جس جگہ سے ہم نے کشتی پر سوار ہونا ہے وہاں ڈر کی تو کوئی بات ہے ہی نہیں"۔

نانی اماں نے کہا۔ "ارے بیٹا! جب ہم سیلاب عبور کر لیں گے اور بے وقوف مگرمچھوں کا خطرہ دُور ہو جائے گا تو پھر اس کے قہقہے سننا"۔

—O—

وُہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر نسرین نے اچانک سوال کیا

"آپ نے پہلے کبھی کشتی پر دریا عبور کیا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "کئی بار!"

"میرا مطلب ہے، سیلاب کی حالت میں؟"

"مَیں نے سیلاب کے دنوں میں تین بار راوی عبور کیا ہے اور ایک بار دریائے بیاس کو عبور کیا ہے۔ مَیں کئی بار دونوں دریاؤں کے آر پار جا چکا ہوں اور مَیں تیر کر بھی دریا عبور کر لیتا ہوں"۔

نانی جان نے پوچھا۔ "بیٹا! دریاؤں پر کس لیے جایا کرتے تھے تم؟"

"ماں جی! شکار کے لیے! پہلے مرغابیوں کا شکار دیکھنے کا شوق تھا۔ اب موقع ملتا ہے تو خود شکار کو چلا جاتا ہوں"۔

"آپ کو دریا سے خوف نہیں آتا؟" نسرین نے پوچھا۔

"بالکل نہیں! مَیں تیرنا جانتا ہوں اور مجھے کشتی کھینا بھی آتا ہے۔ بانس کے ساتھ بھی! اور چپوؤں کے ساتھ بھی!"

نسرین کی نانی نے کہا۔ "بیٹا! اتنا کچھ تم نے کیسے سیکھ لیا تھا؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "اگر پانی کا خوف اُتر جاتے تو آدمی سب کچھ سیکھ لیتا ہے"۔

"تمہارا مطلب ہے اگر کوئی تیرنا سیکھ لے تو پھر اُسے سب کچھ آجاتا ہے؟"

"ماں جی! جب آدمی کے دل سے خوف جاتا رہتا ہے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ تیرنا جانتا ہے"۔

"بیٹا! تم نے یہ نئی بات بتائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے تیرنا کسی سے نہیں سیکھا!"

"ماں جی! مجھے اتنا یاد ہے کہ مَیں نہر کے کنارے چار پانچ فٹ گہرے پانی میں ہاتھ پاؤں مارا کرتا تھا۔ اس کے آگے جاتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایک دن مَیں بے خیالی میں کھڑا تھا۔ پیچھے سے میرے چچا جان آئے اور انہوں نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ تو مجھے ایک دو غوطے آگئے۔ پھر میں نے شاید یہی سوچا کہ ڈرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے مَیں تیرنے لگ گیا اور اس کے بعد سکول میں میرے متعلق مشہور تھا کہ مَیں نہر کو سیدھا

تیر کر عبور کر لیتا ہوں۔"

بیگم احمد نے غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور پھر نسرین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! اب مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو بھی تم نسرین کو ضرور بچا سکو گے۔" نسرین کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اُسے غصہ ظاہر کرنا چاہیئے یا نہیں؟

باب - ۶

اگلے دن دس بجے کے قریب وہ کشتی پر سوار ہو رہے تھے۔ یوسف نے جو تانگہ پسند کیا تھا، اُس کا گھوڑا انہیں کشتی سے کوئی بیس قدم کے فاصلے تک لے آیا تھا باقی راستہ انھیں گھٹنے گھٹنے پانی اور کیچڑ میں پیدل چلنا پڑا۔ سامان اُٹھا کر رکھنے کے لیے ایک قلی اور ایک گھریلو نوکر پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ پانی کی صراحی کے علاوہ وہ ایک تھرماس بھی شکاپور کا میزبان اسٹیشن ماسٹر اپنے گھر سے لے آیا تھا۔ ان کا سامان رکھوانے کے بعد میزبان اسی تانگے پر واپس چلا گیا تھا۔

ایک سفید ریش سکھ جسے ایک نوجوان کشتی تک پہنچانے آیا تھا۔ اُن کا ہم سفر تھا اور وہ بار بار کہہ رہا تھا "بیٹا تم اطمینان سے جاؤ۔ تم میری فکر نہ کرو۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے تم جا کر آرام کرو۔"

نوجوان نے بوڑھے ملاح سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بھئی! یہ میرے باپو جی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔"

بوڑھے ملاح نے کہا۔ "جناب! آپ فکر نہ کریں۔"

کشتی بھر چکی تھی اور تنگ چھپر کے اندر سکڑی سمٹی سواریوں کا دم گھٹ رہا تھا لیکن لالچی ملاح لوگوں کی چیخ پکار کے باوجود مزید سواریاں لادنے پر مُصر تھا۔

یوسف نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور اُس میں سے دو کھجور کے پنکھے نکال کر نسرین کو دیتے ہوئے کہا۔ "نسرین! یہ لو! ماں جی کا گرمی سے بُرا حال ہو رہا ہے۔" پھر اُس

نے اپنی قمیص اُتار کر ٹی شرٹ پہن لی - اور قمیص بیگ کے اندر ٹھونسنے کے بعد نسرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا "نسرین ! اب اس بیگ میں بہت سی اہم چیزیں جمع ہو گئی ہیں - ان سب کی حفاظت آپ کے ذمّے ہے"۔

اچانک اُس کی نگاہ بیگم فریدہ احمد پر پڑی - اُن کا گرمی سے بُرا حال تھا - یوسف نے پانی کی صراحی سے ایک گلاس بھرا - تھرماس سے کچھ برف نکال کر اُس کے اندر ڈالی اور ماں جی کو پیش کرتے ہوئے کہا : "لیجیے ، پانی پی لیجئے" ! اُس نے پانی قبول کرتے ہوئے کہا -

"بیٹا ! میرا دم گھٹ رہا ہے - خدا کے لیے مجھے اس قید خانے سے نکالو" !

"ماں جی ! آپ باہر آجائیں" - یوسف نے کہا -

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی اور چھپر سے باہر ایک جگہ بیٹھ گئی ' وہاں اگرچہ دھوپ تھی لیکن کھلی ہوا میں اُس کے چہرے پر تازگی آگئی تھی - ایک اور خاتون اور اُس کا خاوند بھی جو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے یہ دیکھ کر آگے بڑھے اور نسرین کی نانی کے قریب آ بیٹھے - بوڑھا سکھ بھی کھسکتا ہوا سامنے دوسرے کونے پر پہنچ گیا -

——— ○ ———

"تین ملاحوں میں سے ایک جو بانس پکڑے ہوئے تھا چلایا "سب اندر چلے جاؤ" - باہر کوئی نہیں بیٹھے گا - جو باہر بیٹھے گا اسے ہم کشتی سے اتار دیں گے" !

مسافر پیچھے کھسکنے لگے لیکن نسرین اور اس کی نانی جان پریشان سی ہو کر یوسف کی طرف دیکھنے لگیں -

ملاح پھر چلایا "او مائی سنتی نہیں - میں کیا کہہ رہا ہوں" ؟ اُس نے ابھی اپنا فقرہ پورا ہی کیا تھا کہ یوسف نے آگے بڑھ کر بانس پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے مُنہ پر

اِتنے زور سے تھپڑ مارا کہ وہ پانی میں جا گرا - لوگ شور مچانے لگے : "دیکھو ابھی کشتی پر فساد نہ کرو ، یہ ڈوب جائے گی" ! یوسف نے بلند آواز میں کہا "آپ پریشان نہ ہوں - مَیں کشتی چلانا جانتا ہوں اور انشاء اللہ اسے اکیلا کنارے لے جاؤں گا - ان ملاحوں کی بدتمیزی برداشت نہیں کی جا سکتی" ! پھر وہ بوڑھے ملاّح کی طرف متوجہ ہُوا جو کشتی والوں کا لیڈر معلوم ہوتا تھا - "تم میری طرف کیا دیکھ رہے ہو ؟ اُٹھو ! بانس پکڑلو ، ورنہ مَیں تمہیں اُلٹا لٹکا دوں گا اور سُنو بھائیو ! کسی کے لیے اِس ذلیل چھپر کے اندر بیٹھنا ضروری نہیں ہے - تم اسے توڑ کر نیچے پھینک دو" !

قوی ہیکل ملاّح جو تھپڑ کھا کر پانی میں گرا تھا ، کشتی پر دوبارہ سوار ہو کر سر جھکائے کھڑا تھا -

بوڑھے ملاّح نے کہا "بے وقوف کے بچّے ! تم سب کا بیڑا غرق کر دو گے" اور پھر وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہُوا -

دیکھو بھائیو ! آپ اطمینان سے باہر نکل کر ہوا کھا سکتے ہیں - لیکن یہ صرف ایک کشتی ہی نہیں ہمارا گھر بھی ہے - خدا کے لیے اس کی چھت کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں - مَیں آپ سے معافی مانگتا ہوں" !

ایک ثانیے کے اندر ساری فضا بدل گئی - بوڑھے سکھ نے کہا " او کاکا ! بھگوان تیرا بھلا کرے ذرا میرا ہاتھ پکڑ کر سہارا دینا" - یوسف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس نے کشتی سے نیچے لٹک کر پانی میں غوطہ لگا دیا - پھر کئی لوگ باری باری کشتی سے اُتر اُتر کر پانی میں نہا رہے تھے -

——— ○ ———

ایک جگہ کشتی گھنے درختوں میں سے گذر رہی تھی - کہ اچانک یوسف نے دیکھا کہ ایک درخت پر سانپ لٹک رہا ہے - اُس نے پھر بوڑھے ملاّح کی طرف

متوجہ ہو کر کہا۔ "دیکھو! یا تو تم راستہ بھول گئے ہو' یا جان بوجھ کر کشتی کو غلط راستے
پر لے جا رہے ہو۔ اس کشتی کو اس جگہ پر رہنا چاہیے جہاں سے سڑک گزرتی ہے"۔

"جناب! اس طرح راستہ لمبا ہو جائے گا"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ کشتی کو درختوں سے دُور رکھنا کیوں ضروری ہے۔ سُنو!
اگر اب کشتی سڑک سے اِدھر اُدھر ہوئی تو میں چھپر کو آگ لگا دوں گا۔ آگے پانی اِتنا کم ہے
کہ ہم پیدل چل کر جا سکیں گے"۔

بوڑھے ملّاح نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "او! بے وقوفو! اپنا بیڑا کیوں غرق
کرواتے ہو۔ جس طرح یہ کہتے ہیں اُسی طرح کرو"۔

غروب آفتاب کے قریب کشتی دوسرے کنارے پر پہنچ چکی تھی اور محمود علی اپنے
نوکروں سمیت اُن کے استقبال کو پہنچ چکا تھا۔

نسرین کی نانی نے کہا "یوسف بیٹا! مجھے کشتی سے اتارنے سے پہلے اس صراحی
میں جتنا پانی ہے وہ میرے سر پر ڈال دو"۔

سکھّ نے کہا۔ "بی بی جی! آپ کا بیٹا بڑا ہونہار ہے۔ میں ہمیشہ اسے دعائیں دیا
کروں گا۔ پھر وہ یوسف سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا! لیکن بیٹا جی! ایک بات میری
سمجھ میں نہیں آئی کہ کشتی کو سڑک کے اُوپر سے لے جانے میں بھلا کیا حکمت تھی؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "بابا جی! جو سانپ سیلاب میں بہتے ہوئے آتے
تھے۔ وہ درختوں پر پناہ لے چکے تھے"۔ ایک عورت نے بلند آواز سے کہا۔ "ہائے میں
مر گئی۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ کوئی بہت بڑی بات ہوگی۔ جس کے لیے بھائی صاحب کو
اتنا غصّہ آ رہا ہے"۔ اور نسرین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔



نسرین کی نانی نے پوچھا۔ "بیٹا! تم نے اپنی آنکھوں سے کوئی سانپ دیکھا تھا؟"

"جی ہاں"۔ یوسف نے جواب دیا۔

"بہت بڑا ہو گا وہ!" بیگم فریدہ احمد نے فکرمند ہو کر کہا۔

"بڑا نہیں تھا، لیکن اِس علاقے کا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے"۔

"بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ تمہیں خطرے کا احساس ہو گیا ورنہ اِن درختوں سے کئی
خطرناک سانپ ہماری کشتی پر ٹوٹ پڑتے"۔

"ماں جی! یہ ہو سکتا تھا کہ کسی جگہ گھنے درختوں میں کشتی رُک جاتی اور کوئی سانپ
کسی شاخ سے اُتر کر کشتی پر آ جاتا۔ ورنہ سیلاب کے باعث جانور بھی بہت سہمے ہوئے
تھے۔ جو گاؤں سیلاب میں ڈوب گئے ہیں۔ اُن کے آس پاس جنگلوں سے ہر قسم کے جانور
پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ سانپوں کے لیے درختوں کے سوا کوئی جگہ نہ تھی"۔

نسرین بولی "وہ جانور جو درختوں پر چڑھنا نہیں جانتے۔ سب ڈوب گئے ہوں گے"۔

یوسف مسکرایا اور نسرین نے فوراً اپنے الفاظ پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے
ہوئے کہا۔ "معاف کیجیے۔ مَیں بھول گئی تھی کہ سب جانوروں کو تیرنا آتا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد وہ تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔

بیگم فریدہ احمد نے محمود علی سے یوسف کا تعارف کراتے ہوئے کہا: محمود! یہ میرا بہادر
بیٹا یوسف ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ہمارے ساتھ تھا۔ ورنہ خدا معلوم ہم پر کیا گزرتی؟

نسرین نے کہا۔ "پھوپھا جان! مَیں بتاؤں بھائی یوسف نے کیا کیا تھا؟ کشتی کے
ملّاح بڑے ظالم تھے۔ ایک تو کوئی دیو معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں اُس کی۔ نانی جان
گرمی سے بے ہوش ہو رہی تھیں۔ یوسف بھائی نے کہا۔ "ماں جی! آپ چھپر سے باہر ہوا میں
آ جائیں۔ نانی جان باہر نکلیں ..... میں بھی اِن کے ساتھ تھی۔ پھر بہت سے لوگ چھت سے
باہر نکل آئے۔ اُس بدصورت ملّاح نے سب کو ڈانٹا اور وہ خوف زدہ ہو کر چھت کے نیچے

دوبارہ چلے گئے۔ جہاں گرمی میں دم گھٹ رہا تھا۔ جب اُس نے نانی جان کو بھی ڈانٹنے کی کوشش کی تو یوسف بھائی جان نے اِتنے زور سے —— اِتنے زور سے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ پانی میں گر پڑا۔"

نانی بولی "بس اب چپ ہوجاؤ باقی کہانی گھر جاکر سنا دینا۔"

محمود علی نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں اور اگر نیک شہرت آپ کی نیکی کا صلہ ثابت ہوسکے تو میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نسرین کے ساتھ جالندھر تک جارہے ہو تو وہاں پہنچتے پہنچتے کافی مشہور ہو جاؤ گے!

ویسے ابھی تو یہ ابتداء ہوئی ہے۔ نسرین ہمارے گھر پہنچ کر جب لڑکیوں کو اپنے سفر کے حالات سنائے گی تو یہ داستان بہت دلچسپ ہوگی اور جالندھر تک پہنچتے پہنچتے سفر کے یہ واقعات الف لیلہ کی داستان بن جائیں گے۔"

یوسف نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "ہمارے راستے اوّل تو لاہور ہی سے جدا ہوجائیں گے۔ ورنہ یہ ہوسکتا ہے کہ امرتسر تک ہم ایک ہی گاڑی میں جائیں۔ جہاں سے بہرحال مجھے گاڑی تبدیل کرنی پڑے گی۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا۔ نہیں بیٹا! تم جالندھر تک ہمارے ساتھ جاؤ گے، دو چار دن وہاں ٹھہرو گے! میرا مطلب ہے کہ جالندھر میں تمہاری میزبان نسرین ہوگی اور میں بھی تمہارے قیام کے دوران اِسی کے والدین کے پاس رہوں گی۔"

نسرین نے جلدی سے کہا۔ "نانی جان! یہ وہاں ضرور جائیں گے۔"

یوسف نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ہاں جی! میں پھر کسی وقت حاضر ہوجاؤں گا اور جب تک نسرین خود سے یہ نہیں کہے گی: کہ اب تم جاسکتے ہو۔ میں وہیں ٹھہروں گا۔"

نسرین نے نانی سے لپٹ کر اُن کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولی "بیٹا نسرین کہتی ہے:

"کہ میں تو کبھی یہ نہیں کہوں گی کہ آپ واپس جاسکتے ہیں! لیکن اگر آپ آج سیدھے ہمارے گھر چلیں تو میں پہنچتے ہی آپ سے کہہ دوں گی کہ آپ جس وقت چاہیں واپس جاسکتے ہیں۔"

یوسف بولا! "میں نے چچا جان کو خط لکھ دیا تھا، گاؤں سے کئی لوگ مجھے ریلوے اسٹیشن پر لینے آئیں گے۔ اگر میں نہ پہنچا تو امی جان سخت پریشان ہوں گی اور گاؤں کے لوگوں کو بھی بڑی اذیت ہوگی اور دادی جان کی تو یہ حالت ہوگی کہ وہ ہر گاڑی پر مجھے تلاش کرنے کے لیے دن رات کوئی نہ کوئی آدمی بھیجا کریں گی۔"

بیگم فریدہ نے کہا "بیٹا! اگر امی جان اور دادی جان کے انتظار کا مسئلہ ہے تو تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی راستے میں نہیں رکنا چاہیے۔"

"کیوں نسرین؟"

نسرین نے پھر نانی سے لپٹ کر کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کچھ کہا۔

بیگم فریدہ نے کہا۔ "بیٹا نسرین کہتی ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں روٹھ نہ جاؤں تو تمہیں اپنی امی جان سے اجازت لے کر بہت جلد ہمارے گھر آنا چاہیے۔ ہاں نسرین یہ بھی کہتی ہے کہ وہ آپ کو اپنا ایڈریس لکھ دے گی۔"

یوسف نے کہا: "یہ بہت ضروری ہے! اپنے پھوپھا کے گھر پہنچتے ہی میرے تھیلے سے میری نوٹ بک نکال لیجئے یا میری کتابوں میں سے کسی کتاب کے شروع میں اپنے اباجی کا نام اور گھر کا پورا پتہ لکھ دیجیے۔"

"واہ جی! اپنے گھر کا ایڈریس بھی کوئی ادھورا لکھ سکتا ہے؟"

محمود علی نے کہا۔ "نسرین بیٹی بہت ہوشیار ہے، اس کے جو خط ہمارے گھر آتے ہیں۔ وہ پڑھ کر کسی کو یقین نہیں آتا کہ جو بچی چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے وہ ایسے عمدہ مضامین لکھ سکتی ہے۔"

اگلی صبح یوسف نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ بستر پر لیٹ گیا اور خلافِ معمول گہری نیند سو گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو چند عورتیں اور لڑکے اُس کے گرد جمع تھے اور نسرین اُن سے اُس کی بہادری کے قصّے بیان کر رہی تھی۔ اُس نے پل بھر کے لیے آنکھیں کھولیں پھر شرما کر جلدی سے بند کر لیں۔ خاتونِ خانہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا "بھئی! شور نہ مچاؤ۔ ہمارا مہمان بہت تھکا ہُوا ہے۔" دوسری عورت بولی "بہن یہ شیر معلوم ہوتا ہے خدا اِسے نظرِ بد سے بچائے۔ چلو لڑکیو! اِسے آرام کرنے دو۔"

نسرین نے کہا۔ "آنٹی یہ تو اُس وقت دیکھنے والے تھے جب انہوں نے دیو جیسے ملّاح کو تھپڑ مار کر پانی میں گرا دیا تھا۔"

نسرین کشتی کے واقعات کی ایک ایک تفصیل دہرا رہی تھی۔

نانی جان اچانک کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں "باتونی لڑکی! اب چُپ کرو اور انہیں جگا کر ناشتے کا پوچھ لو۔" یوسف نے اسے امدادِ غیبی سمجھ کر کہا۔ "ماں جی! میں جاگ رہا ہوں۔"

"اچھا بیٹا!" خاتونِ خانہ نے کہا۔ "میں آپ کا ناشتہ لاتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا اور نسرین اُس کے بیگ سے نوٹ بُک نکال کر اپنا ایڈریس لکھ رہی تھی۔ ایڈریس لکھنے کے بعد اُس نے یوسف کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ پڑھ لیں گے نا؟"

"ارے! تمہاری ہینڈ رائیٹنگ تو واقعی بڑی خوب صُورت ہے، نوٹ بُک اُسی طرح بیگ میں رکھ دو اور یاد رکھو، جب تک ہمارے راستے جُدا نہیں ہوتے، اُس کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے۔"

نسرین کی نانی نے کہا۔

"بیٹا آج تم خوب آرام کر سکتے ہو۔ محمود علی کہہ گیا تھا کہ گاڑی جس پر ہمیں آسانی سے جگہ مل سکے گی رات بارہ بجے کے بعد روانہ ہو گی۔ انٹر کلاس کی جو بوگی روہڑی سے ٹرین کے ساتھ لگتی ہے وہ بعض اوقات خالی جاتی ہے اور سیکنڈ کلاس کے ڈبّے سے بھی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ ریل گاڑی دیکھ کر اسٹیشن سے ضرورت کے مطابق ٹکٹ تبدیل کروائے جا سکتے ہیں۔"

باب ۔ ۷

رات انہوں نے کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر سکھر بیراج کی سیر کی اور پھر تانگے پر دھڑی سٹیشن پہنچ گئے اور ایک آدھ گھنٹہ پہلے کراچی سے آنے والی ایکسپریس کے ساتھ لگنے والے انٹر کلاس ڈبّے میں چلے گئے ۔ وہاں وُہ عمر رسیدہ سکھ جسے انہوں نے کشتی میں دیکھا تھا پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا ۔ اُس نے یوسف کو دیکھتے ہی کہا :

”کل مجھے گاڑی نہ ملنے کا افسوس تھا، لیکن اب میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ تُم مجھے بہت یاد آتے رہے ہو۔ میں سوچتا تھا کہ اگر مَیں نے تمہارا ایڈریس پوچھ لیا ہوتا تو کسی دن تمہارے بزرگوں کو سلام کرتا“ پھر عمر رسیدہ خاتون کی طرف متوجہ ہُوا۔

”بی بی جی سلام! یوسف صاحب آپ کے رشتے میں کیا لگتے ہیں ؟“

” بھائی جی ! انسے میرا بیٹا سمجھ لیں“۔

”بی بی جی! وہ تو مَیں سمجھ گیا ہوں ۔ ایسا لڑکا ہر ماں کا بیٹا اور ہر بہن کا بھائی ہوتا ہے ۔ آپ اس طرف آرام سے لیٹ جائیں ۔ بابو کہتا تھا کہ اس گاڑی پر نئی سواریاں آنے کی امید نہیں۔ آپ اس طرف کی دونوں سیٹوں پر قبضہ کر لیں ۔

کاکا جی ! تم میرے پاس اس سیٹ پر آجاؤ اگر کوئی سواری آئی تو ہم اُسے یہاں بٹھا لیں گے “۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو نسرین آہستہ آہستہ اپنی نانی سے باتیں کر رہی تھی ۔

” نانی جان ! ایک کہانی ہوتی ہے دوسرا افسانہ ہوتا ہے اور اگر زیادہ کہانیاں جمع ہو جائیں

تو ناول بن جاتا ہے ۔ یعنی یہ ایک افسانہ تھا کہ یوسف بھائی کے کشتی پر سوار ہوتے ہی ایک ملاح کی شامت آگئی تھی ۔ نانی جان جب ہم سیلاب سے نکل آئے تھے تو یہ افسانہ ختم ہو گیا تھا لیکن نانی جان! جالندھر ابھی بہت دُور ہے“۔

بیگم احمد نے جھنجھلا کر کہا ”با تونی لڑکی ! میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آتی “۔

” نانی جان ! خدا کے لیے آہستہ بات کریں۔ وُہ سن لیں گے تو کیا کہیں گے “۔

” اری کیا سُن لیں گے وہ ! “

نانی جان ! مَیں یہ کہنا چاہتی ہوں ۔ اگر اسی قسم کے ایک دو واقعات اور پیش آجائیں ، فرض کرو کوئی خوف ناک ڈاکو ہمارے ڈبے میں گھُس آئے اور بھائی یوسف پھر ڈاکو کے ساتھ وہی سلوک کریں جو اُس دن دیو قسم کے ملاح کے ساتھ کیا تھا یعنی : یہ اُسے اُٹھا کر گاڑی کے باہر پھینک دیں تو کیا یہ کوئی ناول نہیں بن جائے گا ؟“

نانی نے کہا ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ اس وقت سو جاؤ ۔ مَیں صبح یوسف سے تمہارے سوال کا جواب پوچھ دوں گی “۔



صبح کی نماز کے وقت یوسف گہری نیند سے بیدار ہوا ۔ ریل گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی ۔ اُس نے نیچے اُتر کر پلیٹ فارم پر وضو کیا اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمپارٹمنٹ میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک آدمی اور اُس کے ساتھ تین عورتیں اپنا سامان اٹھائے اندر داخل ہو رہے ہیں اور بوڑھا سکھ اُن سے کہہ رہا ہے: ”بھئی دیکھو ! یہ انٹر کلاس کا ڈبہ ہے “۔

جس آدمی سے وہ مخاطب تھا ۔ اُس کا رنگ گہرا سیاہی مائل تھا اور شکل بھی اُس کی کافی کریہہ تھی ۔ وہ بوڑھے سکھ کو یوں جواب دینے لگا ”بابا ! تم تو اس طرح بات کرتے ہو جیسے یہ گاڑی تمہارے باپ دادا کی ملکیت ہو ۔ ہمارے پاس انٹر کلاس کا سرکاری

پاس ہے اور کوئی ہمیں اس ڈبے میں سفر کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اگر یقین نہیں آتا تو ٹکٹ چیکر کو بلا کر پوچھ لو۔ میں ریلوے کو بیکانیر سے لیبر سپلائی کرتا ہوں اور مجھے ایک افسر کے حقوق حاصل ہیں۔"

اِتنی دیر میں دو اور آدمی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے اور اِن میں سے ایک نے کہا "اچھا ٹھیکیدار جی! اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر کر دی جائے۔"

ٹھیکیدار نے کہا "نہیں تم جاؤ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں! ویسے ان کو یہ شک ہے کہ ہم انٹر کلاس میں سفر نہیں کر سکتے اس لیے گارڈ کو یہاں بھیج دینا!"

اُس نے اپنا پاندان اور ایک بکس نسرین کے پاؤں کی طرف رکھ دیا اور وہ جلدی سے اُٹھ کر اپنی نانی کے پاس بیٹھ گئی۔

سکھ نے کہا "او بھئی ٹھیکیدار تم اِس طرف آجاؤ۔ مَیں نے پہچان لیا کہ تم ایک باگڑی ہو۔"

باگڑی نے بے اعتنائی سے مڑ کر سکھ کی طرف دیکھا اور اپنی عورتوں کے ساتھ ایک سرے پر بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی نسرین اور کبھی اس کی نانی کی طرف دیکھ رہا تھا اور انہوں نے نفرت سے اپنے سر کھڑکی میں سے باہر نکال رکھے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک عورت اپنی جگہ سے اُٹھ کر نسرین اور اُس کی نانی کے پاس آبیٹھی۔ پھر اُس نے پاؤں اُٹھا کر سیٹ پر رکھ لیے۔ نسرین نے دیکھا کہ اُس کے پاؤں میں چاندی کے دو یا تین موٹے موٹے کڑے پڑے ہوتے ہیں جو اُس کی کلائیوں کی طرح موٹے تھے! یہی حال دوسری عورتوں کا تھا۔

یوسف ناول پڑھنے میں مشغول تھا پھر بھی کبھی کبھی وہ اُن کی حرکات دیکھ لیتا تھا۔ اگلے سٹیشن پر اُس نے اُٹھ کر پوچھا:

"ماں جی! آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟"

"ہاں بیٹا! منگوا لو۔ نسرین کو بھوک لگ رہی ہوگی۔"

یوسف باہر نکل گیا۔ جب بیرا ناشتہ لے کر آیا۔ اُس نے باگڑی عورت سے کہا: "انہوں نے ناشتہ کرنا ہے۔ اِس لیے آپ درمیان سے ایک طرف ہٹ جائیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد یوسف نے چائے پینے کے بعد اپنے تھیلے سے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے میں مشغول ہو گیا! اچانک اُس کی نظر دوسری طرف جا پڑی:

نسرین سراسیمگی کی حالت میں اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اپنی موٹی سی باگڑی عورت کی بجائے ٹھیکیدار خود وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

ایک ثانیے کے لیے یوسف کا سارا خون سمٹ کر اُس کے چہرے پر آگیا۔ اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر نسرین کی طرف دیکھا اور اُس نے اپنے دوپٹے کا وہ حصہ جس پر پان کی پیک کا داغ لگا ہوا تھا سامنے کر دیا۔

"او باگڑی کے بچے! تمہیں ہر جگہ گندگی پھیلاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" اُس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

باگڑی نے جواب دیا "تمہیں غصہ کس بات پر آرہا ہے بابو! مَیں نے کھڑکی سے باہر تھوکا تھا لیکن ہوا کے زور سے اِس لڑکی کے باہر لٹکے ہوئے دوپٹے کا سرا تھوک کے سامنے آ گیا تھا۔"

یوسف چلایا "یہاں سے اُٹھو جلدی کرو۔"

باگڑی نے کہا: "یہ گاڑی کسی کے باپ ......

اور ابھی اُس نے اپنا فقرہ پورا نہ کیا تھا کہ ایک زوردار طمانچے کی آواز سنائی دی۔

یوسف نے اُسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا اور پھر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ سیدھا بیت الخلا میں جا گرا۔ کمپارٹمنٹ کے اندر جو اچانک ایک سکوت طاری ہوا تھا اُس میں پہلی آواز بوڑھے سکھ کی سُنائی دی:

"کاکا جی! آپ اِدھر آجاؤ! مَیں نے اِس باگڑی کی شکل دیکھتے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ اُس ملاح سے زیادہ ہی بے وقوف ہے۔"

نسرین نے کہا۔ "نانی جان! مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ قصّہ اب ناول سے بھی زیادہ طویل ہو جاتے۔ یقیناً، یہ تو اُن بھوتوں میں سے ایک ہے جن کے قصے سُنا کر آپ مجھے ڈرایا کرتی تھیں۔"

باگڑی عورتیں جو ایک ثانیے کے لیے سہم کر رہ گئی تھیں یکایک گالیاں دینے لگیں اور ان گالیوں کا ہدف یوسف سے زیادہ نسرین اور اس کی نانی تھیں جو الفاظ یوسف کی سمجھ میں آسکتے تھے وُہ ناقابلِ برداشت تھے۔ اُسے ایسی عورتوں سے لڑنے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ وہ غصے اور بے بسی کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

نسرین کی نانی باہر دیکھ رہی تھی اور نسرین اُس کی گود میں منہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بوڑھے سکھ نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں بیٹا! آخر لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں نا؟"

"باباجی! یوسف نے بے چارگی کی حالت میں کہا:

"اگر انہوں نے زبان بند نہ کی تو مَیں انھیں گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔"

"واہ کاکا جی" سکھ نے کہا "اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اپنی جان خطرے میں یُوں ڈالو گے؟"

یوسف نے کہا: "باباجی! میرے ذہن میں تو یہی آتا ہے کہ انھیں گاڑی سے اُٹھا کر باہر پھینک دوں یا خود گاڑی سے چھلانگ لگا دوں۔"

"ذرا اپنا کان میرے قریب کرو۔"

یوسف نے فوراً اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ سکھ نے کہا: "ان عورتوں کی زبان کی کنجی تمھارے ہاتھ میں ہے۔ ذرا کنجی گھماؤ۔ یہ عورتیں خاموش ہو جائیں گی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ جو مزے سے بیت الخلا سے سر نکال نکال کر اپنی عورتوں کی کارگزاری دیکھ رہا ہے۔ اُسے پکڑ لو۔ وہی کنجی ہے۔ جب وہ دہائی دے گا یہ خاموش ہو جائیں گی۔"

یوسف اطمینان سے آگے بڑھا۔ اُس نے ٹھیکیدار کو چوٹی سے پکڑ کر اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے سکھ کی آواز سنائی دی۔

"او کاکا! ہشیار ہو جاؤ! اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔"

یوسف نے جلدی سے ایک طرف ہٹ کر اُس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن چاقو کی نوک اُس کے بازو کو زخمی کرتے ہوئے نیچے پھسل گئی۔

جواب میں یوسف نے یکے بعد دیگرے چند بھرپور مکے رسید کر دیے اور وہ نیچے گر پڑا۔ یوسف نے پھر اسے اُٹھایا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں باگڑی کی ٹانگیں گاڑی کے اندر تھیں اور جسم کھڑکی کے باہر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر اب میں نے کسی عورت کی آواز سُنی، تو تمہیں کھڑکی کے باہر پھینک دوں گا۔"

باگڑی چلایا: "اری کم بختو! تم میری جان لے کر ہی چھوڑو گی۔ بھگوان کے لئے چُپ ہو جاؤ۔"

عورتیں جو پہلے ہی یوسف کی خون آلود قمیص دیکھ کر سہمی ہوئی تھیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"یوسف تم فوراً اِدھر آؤ"۔ نسرین کی نانی نے جلدی جلدی اپنی گٹھڑی سے ایک دوپٹہ نکالتے ہوئے کہا۔

بوڑھے سکھ نے اُٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "مجھے چار انگل چوڑی پٹی پھاڑ دیں۔ ابھی زخم کس کر باندھنے سے خون بند ہو جائے گا۔ اور سٹیشن پر پہنچتے ہی ہم ڈاکٹر کو بلا لیں گے"

نسرین کی نانی نے پریشانی کے عالم میں دوپٹے سے ایک طرف کپڑا اتارنے کی بجائے لمبے رُخ پٹی پھاڑ دی۔

سکھ نے پٹی پکڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے یوسف کا بازو پکڑا اور کہا "کاکا جی! آپ اُدھر میری کھڑکی کے قریب آجائیے! مَیں اطمینان سے پٹی باندھ لوں گا تو ڈاکٹر کی بھی ضرورت نہیں رہے گی"

سکھ نے یہ کہہ کر سیٹ کے نیچے سے اپنا بیگ نکالا۔ اُس میں سے ایک بوتل نکالی۔ پھر پٹی کا ایک ٹکڑا اتار کر بوتل کے سیال مادے سے تر کرتے ہوئے کہا "یہ قیمتی تحفہ میرے بیٹے نے دیا۔ میرا خیال تھا کہ کسی خاص آدمی کو پیش کروں گا! آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ضرور ہوگی۔ لیکن اس موسم میں اتنے گندے چاقو کے زخم کو کسی ایسی چیز سے ہی صاف کیا جا سکتا ہے"

کمرے میں بدبو پھیل چکی تھی اور یوسف کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ سردار جی کی قیمتی شے کیا ہے؟

یوسف نے اپنے چہرے سے تکلیف ظاہر نہ ہونے دی اور باگڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"مَیں نہیں چاہتا کہ اس سفر میں میرے ہاتھ تم جیسے بدصورت آدمی کے خون سے رنگے جائیں اس لیے اپنا سامان اٹھا کر دروازے میں رکھ لو اور جونہی اگلا سٹیشن آئے، اس کمپارٹمنٹ سے دفع ہو جاؤ"

اور دیکھو! پھر وہ بولا: "تمہاری عورتیں جو گندی زبان استعمال کرتی رہی ہیں۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اس معصوم بچی اور ماں جی دونوں سے معافی مانگو ورنہ میں ایک منٹ سوچے بغیر ان چڑیلوں کو ایک ایک کر کے چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا"

باگڑی چلایا۔ "میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہو، ماں جی کے پاؤں پکڑ لو" وُہ آگے بڑھ کر بیگم احمد اور کبھی نسرین کے آگے ہاتھ جوڑنے لگیں۔ "ماں جی! ہمیں معاف کر دو۔ ہم سے غلطی ہو گئی، ہم ایسا کبھی نہیں کریں گی"

اگلے اسٹیشن کے آثار نظر آنے لگے۔ تو یوسف نے کہا "بس! اب چپکے سے اُتر جاؤ۔ ہمیں تنگ نہ کرو"

اور وُہ لوگ گاڑی رکتے ہی ایک منٹ کے اندر اندر اپنے ساز و سامان سمیت غائب ہو گئے۔



بوڑھے سکھ نے کہا۔ "بی بی جی میں ڈاکٹر کا پتہ کرتا ہوں"۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو بیگم احمد نے پوچھا "کیوں بابا جی! ڈاکٹر نہیں ملا؟"

"بہن جی! میں نے اگلے اسٹیشن پر پیغام بھیج دیا ہے۔ ڈاکٹر وہاں موجود ہوگا"

بوڑھے سکھ نے کہا۔ "یوسف میں بی بی جی کو محض اطمینان دلانا چاہتا ہوں۔ ورنہ ڈاکٹر بھی دیکھے گا تو شاید پٹی بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کرے گا۔ علاج میرے پاس موجود تھا۔ لیکن بہن جی کو بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اچھا! اب گاڑی چلنے والی ہے۔ اگلے اسٹیشن پر میں ڈاکٹر کو لے کر یہیں آجاؤں گا"

جب بوڑھا سکھ اطمینان سے بیٹھ گیا تو یوسف نے کہا۔ "بابا جی! مَیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ سکھ مسکرایا "شکر گزار تو مجھے ہونا چاہیے جو تمہاری وجہ سے ایک چھوٹے سے کام کے لیے زندہ رہا۔ ورنہ اگر گشتی پر تم نہ ہوتے تو مَیں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ

شاید . . . . . . میری زندگی کا سفر ختم ہو گیا ہے۔"

اگلے سٹیشن پر ڈاکٹر کمپاؤنڈر اور سٹیشن ماسٹر تینوں اس کے ڈبے میں پہنچ گئے۔ باہر پولیس کا ایک تھانیدار اور پولیس مین ریلوے سٹیشن پر کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے پٹی کھول کر زخم دیکھا اور مطمئن ہو کر کہا۔" زخم صاف کر کے دوبارہ پٹی کر دیتا ہوں۔ ٹانکے لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ احتیاطاً ایک ٹیکہ بھی لگا دیتا ہوں۔ یہ زخم بہت جلد مندمل ہو جائے گا۔ آپ کو چند گولیاں بھی دے جاتا ہوں۔"

بوڑھے سکھ نے کہا۔" ہاں ڈاکٹر صاحب بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ ٹیکہ ضرور لگا دیں۔ زخمی کرنے والا بہت گندا تھا۔"

تھانیدار نے اندر گھستے ہوئے کہا۔" پرچہ کون لکھوائے گا اور ملزم کہاں ہے ؟"

سکھ نے کہا۔" تھانیدار جی! آپ بہت دیر سے آتے ہیں اب تو کوئی نجومی ہی بتا سکتا ہے کہ ملزم کہاں ملے گا؟

آپ اپنی رپورٹ میں لکھ سکتے ہیں کہ ملزم نے بھاگنے سے پہلے جرم کی معافی مانگ لی تھی۔"

تھانیدار نے سوال کیا! کس سے معافی مانگی تھی؟

"ہم سے جناب!

تھانیدار نے جھنجھلا کر کہا۔" یہ کیا بات ہوئی؟"

زخم کسی کو آتا ہے اور معاف دوسرے کرتے ہیں۔"

سکھ نے کہا۔" تھانیدار جی! آپ تلخی سے بات نہ کریں۔ یہاں کاکاجی کی ماں جی بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔"

"کاکاجی کون ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"یہی جس نے اُس پاگل ٹھیکیدار کو اُس کی بدزبانی کی سزا دی تھی۔"

"سردار جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پاگل ٹھیکیدار کون؟"

"جی پاگل ٹھیکیدار وہی تھا جس نے کاکاجی کو زخمی کیا تھا۔

پھر مار بھی کھائی، تو یہ بھی کی اور بھاگ بھی گیا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اُسی نے چاقو مارا تھا۔"

"تھانیدار جی! مَیں شروع سے یہی کہہ رہا ہوں۔ اب تو شاید وہ واپس بیکانیر جا چکا ہو گا۔"

تھانیدار نے دوبارہ سوال کیا۔" سردار جی! آپ سیدھی طرح کوئی بات نہیں بتا سکتے۔"

"تھانیدار جی! اگر مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ بیکانیر کا رہنے والا ہے تو مَیں اس کے سوا کیا سوچ سکتا ہوں کہ وہ واپس بیکانیر چلا گیا ہو گا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بیکانیر کا رہنے والا ہے۔"

"جناب! وہ خود ہی تو یہ کہتا تھا اور راستے میں جو لوگ اُس سے ملنے آتے تھے "ٹھیکیدار جی" کہہ کر اُسے سلام کرتے تھے! وہ بیکانیر کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ تین عورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ جن میں سے ہر ایک نے کم از کم ایک ایک سیر چاندی پہن رکھی تھی۔ وہ بھی اپنے لباس سے باگڑی عورتیں معلوم ہوتی تھیں اب مَیں اگر کوئی پولیس کا چھوٹا موٹا آفیسر ہوتا تو شاید میرا دماغ سیدھے طریقے سے نہ سوچتا اور میں یہ سمجھتا کہ یہ لوگ کسی اور علاقے کے باشندے ہیں اور مجھے میری آنکھیں دھوکا دے دیتیں۔"

اِس پر سب ہنس پڑے اور تھانیدار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سردار جی! آپ میری عمر کے ہیں اور مَیں آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

سکھ نے ہنستے ہوئے کہا۔" تھانیدار جی! جواب دینے کے لیے یہ جگہ ٹھیک بھی نہیں"۔ یہ چھوٹا سا شیر ہے ناں! مَیں اس کے ساتھ بڑی دور سے سفر کر رہا ہوں اور مَیں دو بار یہ دیکھ چکا ہوں کہ جب کوئی بدتمیزی سے گفتگو کرتا ہے۔ تو بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ حرکت میں آجاتے ہیں۔ آپ کو مَیں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ مجرم جس نے اِس پر چاقو سے حملہ کیا تھا، ریلوے کے سرکاری پاس پر سفر کر رہا تھا۔ زیادہ پان کھانے سے اُس کے دانت سیاہ

ہو چکے تھے اور اُس کے ساتھ جو تین عورتیں سفر کر رہی تھیں۔ وہ بھی پان کھاتی ہیں اور خوب
تھوکتی ہیں۔

سٹیشن ماسٹر نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! آپ کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ مجرم ایک خطرناک آدمی
معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ بھاگ نہ سکے۔"

"میں ابھی فون کرتا ہوں۔" تھانیدار نے مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھائی صاحب فون ضرور کیجئے۔" سکھ نے کہا۔

ڈاکٹر اور اُس کا معاون بھی گاڑی سے اُتر گئے اور جاتے ہوتے ڈاکٹر نے یوسف کے
کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یوسف صاحب! اَب آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ مَیں پولیس سے بھی کہہ دوں
گا۔ کہ اِس ڈبے میں ایک ایسی سواری ہے جسے کسی پاگل نے زخمی کر دیا ہے۔ اِس لیے کسی
اور کو راستے سے نہ بٹھایا جائے۔"



بیگم فریدہ احمد نے گارڈ سے کہا: "بھائی! ڈائننگ کار والے سے کہہ دیں کہ ٹھیک
بارہ بجے ہم سب کا کھانا یہیں بھیج دیا جائے۔"

گارڈ نے پوچھا: "اِن سردار صاحب کے لیے بھی کھانا بھیج دیا جائے؟"

سکھ نے جلدی سے جواب دیا۔ "نہیں بی بی جی! صبح میں ناشتے کے وقت پیٹ بھر کر
کھانا کھایا تھا۔"

بیگم احمد نے کہا۔ "اچھا بیرے سے کہنا کہ اِن کے لیے ٹھنڈے دودھ کا ایک
جگ لیتا آئے، چینی ڈال کر۔"

سکھ نے کہا۔ "بہن جی دودھ ایسی چیز ہے جس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔"

دوسری سیٹ پر یوسف لیٹ گیا اور بیگم احمد نے کہا۔

"بیٹا! زخم میں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"جی نہیں!"

نسرین بولی۔ "ڈاکٹر کی دو گولیاں ابھی کھا لیجیے۔ مَیں پانی لاتی ہوں۔"

اُس نے پانی کا گلاس لا کر پیش کیا!

یوسف نے گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کا گھونٹ لیا اور پھر لیٹ گیا۔

نسرین بولی: یوسف بھائی! ٹیکے سے آپ کو درد ضرور ہوا ہو گا۔ جب انہوں نے
ٹیکے کی سوئی آپ کے جسم میں چبھوئی تھی تو نانی جان نے فوراً دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا اور
میں اگر آنکھیں بند نہ کر لیتی تو شاید میری چیخ نکل جاتی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سوئی ابھی
تک آپ کے بازو میں تھی۔ اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ پھر میری طرف آپ نے دیکھا
اور مسکرانے لگ گئے۔ بھلا اس میں مسکرانے کی کون سی بات تھی!"

یوسف نے لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا اور اُس کے بالوں سے کھیلتے
ہوئے کہا: "تمہیں بلاوجہ خوف زدہ دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔"

"یعنی آپ کو درد بالکل نہیں ہوا!"

"ہوا تھا لیکن اتنا معمولی کہ مَیں نے محسوس بھی نہیں کیا۔"

"مَیں سچ کہتی ہوں کہ خوفناک سوئی دیکھ کر تو نانی جان بھی ڈر گئی تھیں۔"

"جب سوئی بچوں کو چبھوئی جانے لگے تو مائیں ڈر جاتی ہیں۔ اگر میری ماں یہاں ہوتی
تو شاید وہ ڈاکٹر کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتی۔"

"لیکن یہ تو میری نانی جی ہیں۔"

"ماں کی ماں کا دل ماں سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے۔"

نسرین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مَیں آپ کا سر دبا دوں۔"

"وہ کیوں؟"

"مَیں نانی جان کا سر دبایا کرتی ہوں اور امّی اور ابّو کا بھی۔ اور کبھی کبھی امّی میرا سر دبایا کرتی ہیں!"

"مجھے سر دبوانے کی عادت نہیں!"

"اگر کوئی مجھ جیسی بہن ہوتی تو آپ کو یہ عادت پڑ جاتی۔"

"اگر تم جیسی بہن ہوتی تو کئی ایسی عادتیں پڑ جاتیں جو اس وقت میرے ذہن میں بھی نہیں آتیں۔ مثلاً مجھے پڑھنے اور سوچنے کے ساتھ باتیں کرنے کی عادت بھی پڑ جاتی۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں سچ مچ آپ کی بہن ہوتی اور ہمیشہ آپ کے پاس رہتی تو آپ باتیں زیادہ کیا کرتے اور لڑائیاں بھی ہم بہت کیا کرتے۔"

یوسف ہنس پڑا: "یہ تمہاری بات تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکوں گا۔ کہ تم مجھے ایک لڑاکا گنوار سمجھتی ہو۔"

"بالکل نہیں بھائی جان، آپ مجھے لڑتے ہوئے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ کے لیے یہ دعا کیا کروں گی کہ جب آپ اچھی کتابیں لکھا کریں تو ساری دنیا انھیں پسند کرے اور نانی جان بھی آپ کے لیے دعا کیا کریں گی۔"

"ماں جی!" یوسف نے بیگم احمد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: مجھے آج کل نیک لوگوں کی دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ میری مصیبت یہ ہے کہ لوگ قلم سے روزی کمانا ناممکن قرار دیتے ہیں اور ــــ میری خواہش ہے کہ اپنا حلال رزق اِس فن سے تلاش کروں۔"

بیگم احمد نے یوسف کی جانب پورے انہماک سے دیکھا تو وہ انہیں ہمدرد پا کر کہنے لگا:

"میری بدنصیبی تو یہ ہے کہ میرے ابا جان بھی یہ برداشت نہیں کرتے کہ میری کوئی تحریر کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہو۔ وہ مجھے پڑھنے سے نہیں روک سکے لیکن مجھے کوئی قابلِ

اشاعت مضمون یا افسانہ لکھنے نہیں دیتے تھے۔"

نسرین کی نانی نے کہا: "کیوں بیٹا! ایک پڑھے لکھے آدمی میں اتنا تعصب تو نہیں ہونا چاہیے۔"

یوسف نے کہا: "مَیں نے ایف اے کا امتحان دینے سے پہلے ایک ناول لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جسے میں ابا کے خوف سے چھپ چھپ کر لکھا کرتا تھا لیکن میں نے ابھی چند صفحات ہی لکھے تھے کہ ایک دن وہ اچانک میرے کمرے میں آ گئے اور میں لکھے کاغذ چھپانے کی کوشش میں پکڑا گیا۔ انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ مَیں نے کیا لکھا ہے۔ اگر وہ پڑھ لیتے تو شاید واپس چلے جاتے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ چند صفحات بار بار پڑھوا کر سنتے مگر انہوں نے سارا مسوّدہ پرزہ پرزہ کر ڈالا اور میرے لیے غصّہ پی جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔"

نسرین نے کہا: "میں آپ کے لیے دعا کیا کروں گی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آپ کے ابا جان اور خاندان کے ہر آدمی کا دل نرم کر دے اور یہی دعا میری نانی جان، میرے ابّو، امّی، اور ہم سب آپ کے لیے کیا کریں گے۔"

باب - ۸

ریل گاڑی ملتان سے چلی تو بوڑھے سکھ نے کہا۔

"کاکا جی! میرا نام جگت سنگھ ہے۔ خانیوال سے میں نے دوسری لائن پر جانا ہے میرا پتہ شاید تمہیں زبانی یاد نہ رہے اس لیے میں اسے اخبار پر لکھ دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے جگت سنگھ نے اخبار کو تہہ کیا ایک خالی جگہ پر چند الفاظ لکھنے کے بعد یوسف کو اخبار دیتے ہوئے کہا: "کاکا جی! اگر کبھی آپ اجنالہ آئیں تو مجھے ضرور ملیں۔ میرا گاؤں دریا سے بہت نزدیک ہے اور اجنالہ میں میری دو دکانیں بھی ہیں۔ وہاں کسی کے سامنے میرا نام لے لیں۔ وہ آپ کو ہمارے گھر پہنچا دے گا۔"

"تمہارا ضلع گورداسپور ہی ہے نا؟ وہ بھی ہمارے گاؤں کے قریب ہے۔"

"جی ہاں۔"

"میں تمہاری باتوں سے سمجھ گیا تھا۔"

"میرا خیال ہے۔ کہ تمہارے گاؤں کے کہیں آس پاس ہمارے کئی رشتے دار رہتے ہیں۔"

"سردار جی میرا گاؤں دھاری وال سٹیشن سے قریب ہے۔"

"—— او کاکا جی آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ میاں عبدالرحیم کے بیٹے ہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "جی ہاں اگر میں کبھی راوی کی طرف آیا۔ تو آپ کو سلام عرض

کرنے ضرور آؤں گا۔"

جگت سنگھ بولا "بیٹا! تمہاری کچھ باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔ تم کیا لکھنا چاہتے ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بھگوان اچھے انسان بناتا ہے وہ ان کی اچھی خواہشات بھی پوری کرتا ہے۔ اگر تم کسی چیز کو اچھا سمجھتے ہو۔ تو ڈٹے رہو اور اس بات کی پرواہ نہ کرو۔ کہ دنیا کیا کہتی ہے۔؟

یوسف نے کہا۔ "سردار جی! مجھے یقین ہے کہ کسی دن ہر اچھا آدمی میری کتابیں پڑھ کر خوش ہوگا۔"

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر یوسف نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "سردار جی! شاید خانیوال قریب آرہا ہے۔"

جگت سنگھ نے کہا۔ "تم اطمینان سے بیٹھے رہو اور پلیٹ فارم کی طرف کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ کھولو۔ ورنہ بہت رش ہو جائے گا۔ میں پچھلی طرف سے اُتر جاؤں گا اور یہ کوشش کروں گا کہ اس ڈبے سے لوگوں کا ہجوم روکنے کے لیے پولیس کی مستعدی میں فرق نہ آئے۔"

"بی بی جی! سلام! چھوٹی شہزادی جی سلام۔"

جگت سنگھ اپنا بیگ اٹھا کر پچھلے دروازے سے اُتر گیا۔

بیگم احمد ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور کچھ دیر کے لیے کبھی یوسف اور کبھی نسرین کی طرف دیکھتی رہیں۔ انہیں دونوں کے لیے یکساں پیار آتا تھا اور وہ دونوں کے مستقبل کیلئے یکساں دعائیں کر رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔

"یوسف بیٹا! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ چند دن تک تم جالندھر آؤ اور تمہاری امی جان بھی تمہارے ساتھ ہوں؟"

—— میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہاری اور نسرین کی امی میری زندگی میں ایک دوسرے

کی سہیلیاں بن جائیں"۔

بیگم فریدہ احمد نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا "نسرین بیٹی! کوئٹہ سے مجھے گلاب کے عطر کی جو شیشیاں تحفے میں ملی تھیں اُن میں سے ایک نکال کر یوسف کے سوٹ کیس میں رکھ دو۔ تاکہ اپنی امّی جان کے پاس میری طرف سے یہ تحفہ لے جائے۔ اِس بیگ میں نہیں! سُوٹ کیس کے اندر!"

"سنبھال کر رکھنا! کہیں توڑ نہ دینا"۔

نسرین نے اُٹھ کر نانی اماں کا بکس کھولا۔ اُس میں سے ایک عطر گلاب کی شیشی نکالی اور وہ ریشم کے رومال میں لپیٹتے ہوئے یوسف سے کہا۔ اپنا سوٹ کیس کھول دیجئے۔ تاکہ میں احتیاط سے وہاں رکھ دوں

یوسف نے سیٹ کے نیچے پڑا ہُوا سوٹ کیس نکال کر کھول دیا اور نسرین نے عطر کی شیشی اُس کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان جب آپ گھر جا کر سوٹ کیس کھولیں تو سب سے پہلے یہ شیشی نکالیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نوکر کی بے احتیاطی سے گر کر ٹوٹ جائے"۔

"شہزادی صاحبہ آپ فکر نہ کریں۔ مَیں اپنی جان سے زیادہ ماں جی کے تحفے کی حفاظت کروں گا"۔

نسرین کی نانی نے تکیے پر سر رکھتے ہُوئے آنکھیں بند کر لیں تھیں

یوسف نے پہلے اخبار اٹھایا جس پر سکھ مسافر نے اپنا ایڈریس لکھا تھا۔ اسے بے توجہی سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اسی طرح تہہ کر کے رکھ دیا۔ اُس کے بعد اُس نے اُٹھ کر اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی۔ وہ جلدی سے نیچے اُترا اور تھوڑی دیر بعد جب پلیٹ فارم کے نل سے وضو کر کے واپس آیا، تو کمپارٹمنٹ میں تین سواریاں جن میں سے دو ہندو اور ایک کوئی مسلمان زمیندار معلوم ہوتا تھا بیٹھ گئیں۔ ایک ہندو اور ایک زمیندار خالی سیٹ پر اس طرح بیٹھے کہ جس جگہ چار

سواریاں آسکتی تھیں وہ صرف دو کے لیے کافی معلوم ہوتی تھیں۔ تیسرے کو باقی دو سیٹوں پر ایک عورت اور ایک بچّی کا آرام سے سونا پسند نہ آیا اور اُس نے جُھک کر نسرین کا بازو ہلاتے ہوئے کہا۔

"او کاکی! یہ سونے کا وقت نہیں ہے"۔

یوسف نے اُس کا بازو جھنجوڑ کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

"سامنے اُس سیٹ پر دو اور آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ تم بچّوں کو کیوں تنگ کرتے ہو؟"

ہندو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ساتھی نے ایک طرف کھِسک کر سیٹ کا وُہ حِصّہ خالی کر دیا، جہاں یوسف کی کتاب اور اخبار پڑا ہوا تھا۔ یوسف نے کہا: جائیے وہ سیٹ خالی ہے۔ مَیں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں اور کچھ دیر کھڑا رہنا چاہوں گا۔ بنیے نے آگے بڑھ کر کتاب اور اخبار ایک طرف کر دیے اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اِتنی دیر میں گاڑی چل پڑی۔

اِس عرصے میں بنیا جس جگہ پر بیٹھا ہوا تھا وہاں سے اُٹھا اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا! وہ ایک مسلمان کے پاس ایسا اخبار دیکھ لینا بھی کامیابی سمجھتا تھا جس پر گاندھی ابوالکلام آزاد اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی تصویریں نمایاں تھیں۔

اُدھر انگریزی کی کتاب پر ایک نظر ڈال کر وہ پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا۔ اُس نے دوسرے ہندو ساتھی سے کہا۔

"سیٹھ نارائن داس! میں نیشنلسٹ مسلمان کو دیکھتے ہی پہچان لیتا ہُوں"۔

یوسف نے کہا۔ "میں ایک مسلمان ہوں اور ایک مسلمان پہلے بھی مسلمان ہوتا ہے اور بعد میں بھی مسلمان ہوتا ہے"۔

زمیندار بولا! بابو جی! مَیں تو ایک گنوار آدمی ہوں، یہ ہمارے پنڈت درگا پرشاد

جب کسی مسلمان پر خوش ہوتے ہیں تو اُسے نیشنلسٹ یا قوم پرست کہہ کر تھپکی دیتے ہیں۔ آپ سمجھائیں اس کا مطلب کیا ہے؟

یوسف نے جواب دیا: "چوہدری جی! پنڈت صاحب کی تھپکیاں کئی مسلمانوں کو لے ڈوبیں گی اور ہندوؤں کا تو بالکل ستیاناس کر دیں گی۔"

پنڈت درگا پرشاد نے فوری طور پر موضوع بدلتے ہوئے کہا: "میاں جی! آپ اس اخبار میں چند بھگتوں کی تصویریں دیکھ کر غصے میں آ گئے یا کوئی اور بات ہے؟"

یوسف نے جواب دیا: "پہلے میں چوہدری صاحب کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔"

"چوہدری صاحب اگرچہ میری عمر اور تجربہ زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس بات کا یہ جواب دے سکتا ہوں کہ یہ دونوں الفاظ ان لوگوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جو برہمنی سیاست کا مکروہ چہرہ چھپانے کے لیے نقاب کا کام دے سکیں۔ اب پنڈت جی کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس اخبار میں ہندو دیش بھگتوں کے علاوہ اُن مسلمانوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کانگرس باربرداری کا کام لیتی ہے اور شاید آپ کے ساتھیوں نے میرے پاس یہ اخبار دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ مَیں بھی ان کی پسند کا جانور ہوں۔"

"اصل میں یہ اخبار ایک سکھ کے پاس تھا اور میرے پاس اِس لیے پڑا ہوا ہے کہ اس پر اس کا ایڈریس لکھا ہوا ہے۔"

سیٹھ نرائن داس نے کہا: "بابو جی! پنڈت درگا پرشاد نے آپ کو نیشنلسٹ کہا ہے کوئی گالی تو نہیں دی۔"

یوسف نے کہا: "پنڈت جی بے وقوف نہیں۔ اور ایک عقل مند آدمی کو گالی دینے سے پہلے بہت کچھ سوچا کرتا ہے۔"

زمیندار جس کا نام چوہدری اللہ بخش تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا: "میرا خیال ہے کہ عقل مند آدمی بحث شروع کرنے سے پہلے ہی یہ سوچ لیتا ہے کہ جس کے ساتھ بحث کرنے لگا ہوں۔ وہ کیا ہے؟ ورنہ اب تک پنڈت جی وہ ساری باتیں دہرا چکے تھے۔ جو وہ ہم سے کیا کرتے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا۔ جب نرائن داس نے وہ کتاب کھول کر فوراً بند کر دی تھی۔ اگر اُس میں سے کوئی بات اُن کی سمجھ میں آ جاتی تو یہ ہمارا سر کھا جاتے۔" میں نے دیکھا ہے کہ جب یہ ہندو اخبار قائد اعظم کے کوئی کارٹون شائع کرتے ہیں یا مسلمان لیڈروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو سیٹھ نرائن داس خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور کچھ پرچے خرید کر بانٹ دیا کرتے ہیں۔"

پنڈت درگا پرشاد نے کہا: "چوہدری جی! ہمیں ایسے جھگڑوں سے کیا فائدہ ہمیں آپس میں شانتی اور پریم سے رہنا چاہیے۔ یہ دنیا چار دن کا میلہ ہے۔"

یوسف بولا: "اور چار دن کے میلے کی ساری خوشی صرف پنڈت جی کے لیے ہے یا کسی اور کا بھی حصّہ ہے؟"

"پنڈت جی یہ کب کہتے ہیں کہ کسی اور کا حق نہیں!"

"کتنے بھولے ہیں آپ؟ انگریز نے ابھی اپنا بستر لپیٹا نہیں اور آپ اپنا بچھونا ڈالنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔

ہمیں وہ شانتی اور پریم کا سبق دیتے ہیں اور خود انگریز سے خفیہ سودے بازیاں ہو رہی ہیں: کہ آپ نہ صرف اپنی سنگینیں ہمارے حوالے کر دیں بلکہ مسلمانوں کو اس طرح کس کر باندھ دیں کہ جب ہم انھیں قتل کرنا چاہیں تو وہ اپنی گردن تک نہ ہلا سکیں۔"

نرائن داس نے کہا: جن لوگوں نے بھارت ماتا کی آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں

اُن پر ایسے الزام لگانا پاپ ہے ! میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں —— کیا آپ کے خیال میں یہ قوم پرست مسلمان جنہوں نے آزادی کی جنگ میں جیل خانوں کی سختیاں برداشت کی ہیں اور یہ سکھ جو ہمیشہ آزادی کی جنگ میں دوسروں سے دو چار قدم آگے ہوا کرتے ہیں سب بے وقوف ہیں ؟"

یوسف نے کہا : "نیشنلسٹ مسلمان اُس ہندو کانگرس کے چہرے کے نقاب ہیں جس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ گوراشاہی کے بعد بنیا اور برہمن شاہی قائم ہو جائے گی۔ نقاب دُنیا کو دھوکا دینے کے لیے ہوتا ہے۔ اِسے اپنا کام لینے کے بعد اتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔ رہی بات سکھوں کی ! تو —— ان کے متعلق میں یہ مانتا ہوں کہ تم ان کے دل و دماغ میں بُری طرح گھس گئے ہو، لیکن وہ دن دُور نہیں جب ان کے اندر بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے ، جو مکر و فریب کے ان گنت نقابوں میں تمہارے چہرے کے گھناؤنے خدوخال پہچان لیا کریں گے ، لیکن وہ وقت شاید بہت دیر سے آئے ! بعض بد نصیب قومیں اُس وقت خوابِ غفلت سے بیدار ہوتی ہیں جب دشمن انہیں آہنی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ یا اپنا خنجر اُن کے سینے پر رکھ لیتا ہے اور وہ اِتنے بے بس ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ چیخنا بھی چاہیں ، تو اُن کے حلق سے آواز نہیں نکلتی ۔"

بابو جی ! آپ کہاں پڑھتے ہیں ؟

"مَیں اسلامیہ کالج کا طالب علم ہوں ۔"

پنڈت درگا پرشاد نے کہا ۔" میرا بھی یہی خیال تھا کہ ایسے نئے خیالات صرف وہاں پڑھنے والوں میں پیدا کیے جاتے ہیں ۔"

" یوسف بولا : " پنڈت جی ! اگر آپ اسلامیہ کالج کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں ، تو اُس کے لیے آپ کو عقل کی ضرورت نہیں ۔ مَیں نے بنیے اور برہمن ذہنیت کے متعلق جو معلومات حاصل کی ہیں وہ مجھے اسلامیہ کالج سے نہیں بلکہ باہر سے حاصل ہوئی ہیں :

میں ایک دیہاتی ہوں ۔ مَیں نے بھارت کے برہمنوں کا مسلمانوں سے شودروں کا سا سلوک دیکھا ہے ۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بنیا ساہوکار غیر ہندوؤں کو کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے ۔

مَیں نے اُن مذہبی ، اخلاقی اور سیاسی اداروں کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے جن کی بنیاد ہی نفرت پر رکھی گئی ہے ۔ گاندھی اور اس کے چیلے ہندوستان پر حکمرانی کا جو خواب دیکھ رہے ہیں ۔ اُس کا ماضی اس نفرت کی سیاہی میں ڈوبا ہوا ہے ۔ وہ بیسویں صدی کی تیز رفتار مشینوں کی جگہ پتھر اور دھات کے انتہائی مکروہ ترین ادوار کو واپس لانا چاہتے ہیں ۔"

چوہدری اللہ بخش نے کہا : میاں جی ! میں نے کل واپس آنا تھا لیکن سیٹھ نارائن داس مجھے آج ہی کھینچ لائے ، شاید اس لیے کہ اللہ نے آپ سے ملاقات کروانی تھی جس کے لیے مَیں ان کا شکر گزار ہوں ۔ آپ سے باتیں کرنے کا بڑا لطف آیا کہ اب یہ لوگ پاکستان کے خلاف کچھ سوچ سمجھ کر بات کیا کریں گے ۔ اگر مسلمان قوم میں آپ جیسے پندرہ بیس اور نوجوان موجود ہوتے تو پھر پاکستان بن کر رہے گا ۔

" چوہدری جی ! آپ اطمینان رکھیں پاکستان کا ہر شہری مجھ جیسا ہی ہو گا ۔

چوہدری اللہ بخش نے اخبار سے کاغذ کا ایک پرزہ پھاڑتے ہوئے کہا ۔

" میاں جی ! اگر یہ اخبار ایڈریس لکھنے کے کام آتا ہے تو مَیں بھی اپنا ایڈریس لکھ دیتا ہوں ! جب کبھی آپ منٹگمری (ساہیوال) آئیں تو مجھے ضرور ملیں ۔ ہماری زمین بالکل شہر کے قریب ہے اور عام رہائش شہر میں ہے ۔ اور اب بھی اگر آپ وہاں پہنچ سکیں تو ہمارے گھر تک بآسانی آ جائیں گے ۔"

یوسف نے کہا " چوہدری صاحب ! اس وقت تو ممکن نہیں پھر کبھی ملنے کی کوشش کروں گا ۔ اور ضرور ملوں گا ۔"

چوہدری صاحب! یوسف صاحب سے آپ صرف ملیں گے ہی نہیں۔ بلکہ آپ ہمارے ہاں چند دن قیام بھی کریں گے اور اگر شکار کا شوق ہوا تو شکار کو چلیں گے! میرے چھوٹے بھائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ شاید آپ کو دیکھ کر وہ کچھ بدل جائیں۔"

سیٹھ نارائن داس نے کہا: "دیکھا پنڈت جی! ہمارے دوست ابھی سے اس طرح باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔ جیسے پاکستان بن چکا ہے۔"

یوسف نے کہا: "پاکستان ضرور بنے گا لیکن یہ حقیقت تم برسوں تک جھٹلاتے رہو گے۔"

نارائن داس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "منٹگمری آگیا ہے"۔

چوہدری اللہ بخش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں جی! اب آپ کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے۔ میں نے بیٹھنے کے لیے اس لیے نہیں کہا۔ کہ آپ کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے اچھے لگ رہے تھے۔ اب آپ تھک گئے ہوں گے بیٹھ جائیں اور وعدہ کریں کہ جب کبھی آپ کو موقعہ ملے گا آپ میرے پاس ضرور ٹھہریں گے۔"

یوسف نے کہا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی مجھے یہاں ٹھہرنے کا موقعہ ملے گا تو میں آپ کو ضرور تلاش کروں گا۔"

——— ○ ———

چوہدری اللہ بخش رخصت کے وقت یوسف سے بغل گیر ہونے لگا، تو نسرین چلائی "جی ان کا بازو زخمی ہے۔"

چوہدری اللہ بخش نے حیرت سے پوچھا "یہ بازو کیسے زخمی ہوا؟" "جی! ایک بیوقوف نے چاقو مارا تھا۔"

چوہدری اللہ بخش نے کہا "وہ متعصب کانگریسی ہوگا؟ پولیس نے گرفتار نہیں

کیا اسے؟

"نہیں!" ——— نسرین بولی، "انہوں نے خود ہی اس کی مرمت کر دی تھی اور وہ گاڑی سے اتر کر بھاگ گیا تھا۔"

گاڑی سے اترتے ہی نارائن داس نے پنڈت درگا پرشاد سے کہا۔

"پنڈت جی! آج آپ بچ گئے۔ ورنہ جب اپنی جگہ بنانے کے لیے تم بچی کو اٹھا رہے تھے۔ اس نے تمہاری طرف اس طرح دیکھا تھا، جیسے وہ تمہیں کچا کھا جائے گا۔"

نسرین نے پانی کا ایک گلاس اور تھرماس سے ایک برف کی ڈلی نکال کر اس میں ڈالنے کے بعد یوسف کو پیش کرتے ہوئے کہا "لیجیے! آپ کو پیاس لگ رہی ہے۔"

یوسف ایک ہی سانس میں سارا گلاس پی گیا اور پھر اس نے پوچھا۔ "ایک اور لیجیے۔"

"شکریہ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے"۔ نسرین نے جواب دیا۔ "واہ جی! اس کے لیے بھی کچھ سوچنے کی ضرورت ہے؟ آپ اتنی دیر کھڑے تقریر کرتے رہے تھے۔ گرمی تھی اور پنکھا آپ سے دور تھا۔ آپ کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی کے شور میں بلند آواز سے بولنے کی ضرورت پڑی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ آپ کو ٹھنڈا پانی پلاؤں۔ لیکن پھر سوچا کہ وہ احمق ہنس پڑیں گے۔"

"جی ہاں!" وہ پھر بولی: "میں نانی جان سے بار بار کہہ رہی تھی کہ آپ کو بیٹھنے کو کہا جائے۔ جب آپ اس بنیئے سے الجھنے لگے تھے تو میں نانی جان کے کان میں کہہ رہی تھی۔ نانی جان! اس کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اب ہم ناول سے بڑی چیز دیکھ رہے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس بنیئے میں اتنی عقل ضرور تھی کہ اس نے نرم ہو جانے میں عافیت سمجھی اور بحث میں الجھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔"

——— ○ ———

نانی نے پوچھا۔ "بیٹا! گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرے گی؟"

یوسف نے جواب دیا: "ماں جی! کوئی دس منٹ ٹھہرے گی۔"

"بیٹا! ایسا کرو کہ نسرین کو پلیٹ فارم پر گھما لاؤ۔ بیٹھے بیٹھے تنگ تو میں بھی بہت آگئی ہوں لیکن مجھے لاہور پہنچنے کا انتظار رہے گا اور وہاں مجھے گھومنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔"

نسرین نے سر کا دوپٹہ اوڑھ لیا اور پلیٹ فارم پر اُترتے ہی یوسف کا ہاتھ پکڑ لیا۔

جب وہ دوبارہ گاڑی پر سوار ہوئے تو نسرین نانی کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

"نانی جان! ایک بات سے میں بہت ڈر گئی تھی: جب وہ اُسی باگڑی کو گاڑی سے نیچے پھینک رہے تھے تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی تھی۔ اُس وقت ایسے محسوس ہُوا تھا جیسے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا: "شہزادی صاحبہ! یہ تو صرف ایک ڈرامہ تھا۔ تم نے یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ میں نے ایک ہاتھ سے اُس کی ٹانگ پکڑ رکھی تھی ——"

"بھائی جان! میں بھی حیران تھی کہ وہ آدھا گاڑی سے باہر نکلا ہوا ہے مگر گرتا بھی نہیں، اب معلوم ہوا ہے کہ آپ اُسے ڈرا بھی رہے تھے اور بچا بھی رہے تھے۔ بھائی جان! یہ وعدہ کیجیے گا کہ آپ کو مجھ پر کبھی غصہ نہیں آئے گا!"

یوسف مسکرایا: "تم پر؟"

"اگر تم وعدے سے خوش ہو سکتی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے ننھی نسرین پر کبھی غصہ نہیں آئے گا۔"

"ننھی نسرین نہیں! جب میں بڑی ہو جاؤں تب بھی!"

"جب آپ بڑی ہو جائیں گی تب بھی!"

"اور آپ کو دکھاوے کا غصہ بھی نہیں آئے گا!"

یوسف ہنس پڑا: "میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یوسف نے لفافہ اٹھا کر اس پر عمر رسیدہ سکھ کے لکھے پتے پر نظر ڈالی اور چونک پڑا:

"ماں جی! میں بھی حیران تھا کہ سردار جگت سنگھ نے اس پر اپنا ایڈریس لکھنے میں اتنی دیر کیوں لگائی۔ اصل میں انہوں نے دو ایڈریس لکھے ہیں! ایک تو راوی کے کنارے اُنکے پرانے گھر کا ہے اور دوسرے ایڈریس میں اس گاؤں کا نام ہے جو ہمارے گاؤں سے کوئی دس میل دُور ہے اور میں وہاں سے تین چار بار گذر چکا ہوں۔"

نسرین! بھئی میں تمہیں پھر ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ یہ اخبار لپیٹ کر میرے ہینڈ بیگ میں رکھ دو۔"

نسرین نے اخبار اُوپر کے برتھ پر پڑے ہوئے بیگ میں رکھ دیا اور پھر اپنی نانی کی طرف متوجہ ہو کر بولی: "نانی جان، یہ بات کتنی اچھی ہوتی کہ چچا جان لاہور میں ہوتے اور ہم آج اُن کے پاس رُک جاتے۔"

"بیٹی! بات تو تمہیں ٹھیک ہی سوجھی ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ بیک وقت انبالہ اور لاہور میں تو نہیں ہو سکتے اور تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ اگر تمہارے چھوٹے چچا —— ولایت نہ جا چکے ہوتے تو تمہارے لیے اور زیادہ خوشی کی بات ہوتی۔"

"نانی جان، چھوٹے چچا جان کے متعلق تو میں بہت سوچا کرتی ہوں مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ فہمیدہ آپا ان کے ساتھ کئی بار چڑیا گھر کی سیر کر چکی ہیں لیکن جب بھی میں لاہور جاتی وہ اپنے امتحانوں میں مصروف ہوتے تھے۔"

"بیٹی! اپنی تعلیم ختم کر کے جب وہ لاہور واپس آئے گا تو میں اسے کہوں گی کہ وہ تمہیں جی بھر کر چڑیا گھر کی سیر کرائے اور اس بات کی کوشش کرے کہ چڑیا گھر والے تمہارے لیے وہاں ایک خوبصورت سا پنجرہ بنوا دیں۔"

یوسف نے کہا: "ماں جی، شہزادی کے لیے سونے کا پنجرہ ہونا چاہیے۔"

"بیٹا! بات یہ ہے کہ اس کے چچا ولایت سے بہت بڑے ڈاکٹر بن کر واپس آئیں گے۔ اس لیے ان کے لیے سنہری پنجرہ مہیا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔"

نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا "نانی جان، اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ، نانا جان، امی، ابو، چچا اور چچیاں سب ہر روز مجھے دیکھنے کے لیے چڑیا گھر آیا کریں گے تو مجھے لوہے کے پنجرے میں رہنے پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا، لیکن میری بھی ایک شرط ہے کہ بھائی یوسف بھی مجھے دیکھنے آیا کریں گے...... اور فہمیدہ آپا بھی۔"

"بھئی وہ تو ضرور آئے گی اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے لیے چنے، مونگ پھلی اور کیلوں کا راشن وہی لایا کرے گی۔"

یوسف نے کہا "ماں جی، یہ تو بہت زیادتی ہوگی! اس شہزادی کو تو چڑیا گھر کے اندر بھی بہت اچھے اچھے کھانے ملنے چاہئیں۔"

"بھائی جان! اس بات کی آپ فکر نہ کریں مجھے یقین ہے کہ آپا فہمیدہ میرے لیے بہترین کھانا لایا کریں گی۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا "بیٹا! یہ جس چھوٹے چچا کا ذکر کر رہی ہے وہ پچھلے دنوں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا ہے! اس کا بڑا بھائی جو فوج میں ڈاکٹر ہے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ اسے یورپ کے بعد کچھ عرصہ امریکہ بھی جانا چاہیے بڑا ذہین بیٹا ہے وہ، اس کا دوسرا چچا جس کا ایک گھر لاہور میں بھی ہے۔ پولیس انسپکٹر ہے۔ لاہور والا مکان اُسے اپنے سسرال سے ملا۔ جب وہ لاہور میں ہوتا تھا تو اس گھر میں بہت رونق تھی۔ نسرین کا چھوٹا چچا تعلیم کے زمانے میں وہاں گیا تھا اور اُس کی چچی بلقیس فہمیدہ کو بھی وہیں لے آئی تھی۔ ہم بھی اکثر وہاں جایا کرتے تھے اور نسرین ہر بار یہ پروگرام لے کر جاتی تھی کہ وہ چھوٹے چچا کی انگلی پکڑ کر سیر کرے گی لیکن اتفاق ایسا ہوتا تھا کہ اُسے فہمیدہ کی طرح اس کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔"

نسرین نے کہا "بھائی جان! مجھے چچا جان نے انگلستان پہنچتے ہی خط لکھا تھا کہ جب وہ یورپ سے واپس آئیں گے تو ہمیں خوب چڑیا گھر کی سیر کرائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی دن وہ بیرونی ممالک کا دورہ کریں گے تو مجھے بھی دنیا کے بہترین چڑیا گھر دکھانے ساتھ لے جائیں گے۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا "بیٹا! میں اب سوچتی ہوں کہ تمہارے ساتھ نسرین کے اتنی جلد مانوس ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ اسے تم میں اور ــــ مجھ میں کوئی مشابہت نظر آتی ہے۔"

○

اوکاڑہ سے آگے یوسف نے مغرب کی نماز ادا کی اور جائے نماز اپنے بیگ میں رکھ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ نسرین نے جھجکتے ہوئے پوچھا "بھائی جان، آپ نے میرے لیے بھی دعا مانگی ہے؟"

"ہاں میں سب کے لیے دعا مانگا کرتا ہوں۔"

"بھائی جان! میں نے سب کے متعلق نہیں پوچھا صرف یہ پوچھتی ہوں کہ میرے لیے بھی دعا مانگی ہے یا نہیں؟" یوسف نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو تمہیں دعاؤں کی ضرورت نہیں تاہم مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے تمہارے لیے دُعا کیا کروں گا۔"

بیگم احمد اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں "نسرین نے تمہیں جالندھر میں اپنے والد کے گھر کا پتہ لکھ دیا ہے۔ مَیں امید کرتی ہوں کہ تم کسی دن ضرور آؤ گے۔ نسرین کے بھائی بہن اور والدین تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

یوسف نے کہا "ماں جی، مَیں انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔"

نسرین بولی "بھائی جان! آپ کا یہ خیال درست نہیں تھا کہ اگر آپ دیر سے آئیں گے تو میں پہچان نہیں سکوں گی۔ اگر آپ کی صورت بدل بھی جائے تو بھی آپ کے

ماتھے پر زخم کا نشان دیکھ کر میں پہچان لوں گی"۔

فریدہ احمد نے کہا "بیٹا یوسف میرے قریب آؤ"۔

یوسف جب قریب آیا تو انھوں نے اس کی پیشانی کے بائیں جانب شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "بیٹا یہ زخم تمہیں کیسے لگا؟"

جی میں بچپن میں گھوڑے سے گر پڑا تھا نوکیلے پتھر سے زخم لگا تھا"۔

نسرین بولی: "بہت خون بہا ہوگا ان کا اور ان کی امی بہت روتی ہوں گی"۔

یوسف نے مسکرا کر جواب دیا "جب میں گھر پہنچا تھا تو میرے سر پہ پٹی بندھی تھی اور میری امی کو رونے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی"۔

نسرین کی نانی بولیں "بہادر بیٹوں کی مائیں رویا نہیں کرتیں"۔

"لیکن ان کو درد تو بہت ہوا ہوگا"۔

یوسف نے جواب دیا "مجھے یاد نہیں مجھے کیا محسوس ہوا تھا"۔

نسرین نے نانی سے لپٹ کر اس کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولیں "بیٹا یوسف، نسرین ایک بات پر بہت ناراض ہے اور وہ یہ ہے کہ تم نے جالندھر میں اس کے گھر جانے کی دعوت ٹھکرا دی ہے"۔

"نہیں ماں جی، نسرین اتنی اچھی بچی ہے کہ اس بات سے ناراض ہوتی ہی نہیں"۔

نسرین نے پھر نانی کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولیں "بیٹا وہ کہتی ہے کہ نسرین اچھی بچی نہیں ہے"۔

یوسف نے کہا "ماں جی آپ اسے سمجھائیے کہ میں امرتسر تک اس کے ساتھ رہوں گا اور باتیں کرنے کے لیے کچھ اور وقت مل جائے گا۔ میں گھر پہنچتے ہی خط بھیجنا شروع کر دوں گا اور کسی دن میرے خط میں یہ لکھا ہوگا کہ میں فلاں فلاں دن فلاں گاڑی سے شہزادی صاحبہ کو سلام کرنے کے لیے جالندھر پہنچ رہا ہوں"۔

نسرین ہنس پڑی اور نانی نے کہا "یہ تو بہت اچھا ہوا کہ امرتسر تک ساتھ ہے"۔

جب لاہور دس منٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اب میں عشاء کی نماز پڑھ ہی لوں تو بہتر ہے۔ اچھا نسرین تم یہ بتاؤ کہ تمہارے لیے کیا دعا مانگوں"۔

نانی نے نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بیٹا اس کے لیے یہ دعا مانگو کہ یہ پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لے اور باتیں کم کرے"!

نسرین نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا "میں کب زیادہ باتیں کرتی ہوں"! اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نانی نے کہا "میں تو مذاق کر رہی تھی"۔

"میں اب کوئی بات نہیں کروں گی"۔

"مجھ سے بھی بات نہیں کرو گی"۔ یوسف نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"ہاں، آپ سے بھی نہیں ..... کسی سے بھی نہیں"!

یوسف مسکراتا ہوا آگے بڑھ کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو اپنے بہن بھائیوں، عزیزوں کے ساتھ نسرین کا نام بھی شامل ہو چکا تھا"۔

یوسف نے نماز سے فارغ ہو کر نسرین سے کہا "نسرین اللہ تعالیٰ سے تمہارے لیے میں نے بہت کچھ مانگا ہے"۔

بیگم احمد نے کہا "بیٹا، اللہ نسرین کے لیے تم جیسے لوگوں کی دعائیں قبول فرمائے۔ یوں تو کبھی کبھی میں بھی اس کے جھگڑوں سے تنگ آجاتی ہوں مگر میں اس کے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتی"۔

نسرین نے چونک کر کہا "میں کب جھگڑا کرتی ہوں نانی جان؟"

"بیٹی میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے تمہارے جھگڑوں پر بھی پیار آتا ہے"۔

"پھر وہی بات نانی جان! میں کہتی ہوں کہ میں جھگڑا نہیں کرتی آپ ہمیشہ مجھ پر

الزام لگاتی ہیں۔"

"اچھا... اب خاموش ہو جاؤ۔ لاہور آنے والا ہے... اپنے بھائی سے باتیں کر، وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ تم ان سے روٹھ گئی ہو۔"

"نہیں، نانی جان وہ ایسا نہیں سمجھ سکتے انہیں معلوم ہے کہ میں ان سے نہیں روٹھ سکتی۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا: "نسرین ابھی تو تم مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم مجھ سے ناراض ہو چکی ہو۔"

"میں تو مذاق کر رہی تھی اور مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے مذاق کر رہی تھی۔"

"اچھا اب میرے پاس بیٹھ جاؤ اور مجھے اپنے اسکول کی باتیں سناؤ۔" نسرین نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا" واہ جی، ہمارے اسکول کی باتیں بھی کوئی سننے والی ہوتی ہیں۔"

"گھنٹی بجتی ہے۔ حاضری لگتی ہے، پھر اسکول کی کاپیاں دیکھی جاتی ہیں، سبق سنائے جاتے ہیں۔ کسی کو شاباش اور کسی کو "ویری گڈ" کہا جاتا ہے۔ اور کسی کی پٹائی ہو جاتی ہے۔ کسی کی پٹائی کی باری آتی ہے تو گھنٹی بج جاتی ہے، وہ سزا سے بچ جاتی ہے۔ بس اسی طرح ہوتا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ جلدی جلدی اسکول سے نجات ملے اور کسی کالج میں جاؤں، کہتے ہیں وہاں پٹائی وغیرہ نہیں ہوتی!!"

"اچھا نسرین کبھی تمہاری پٹائی ہوئی ہے؟"

نسرین مسکرائی" واہ جی آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میری پٹائی ہوتی ہوگی میں تو ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں۔ نانی جان سے پوچھ لیجیے۔"

یوسف نے کہا" مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں گی۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ اپنے خاندان کا نام روشن کریں گی

اور مجھے توقع ہے کہ کسی دن اخبار میں تمہاری تصویر دیکھ کر میں فخر سے کہوں گا کہ اس بھولی بھالی لڑکی کو مدت سے جانتا ہوں۔"

نسرین نے کہا" آپ کو یقین ہے کہ آپ مجھے بھول نہیں جائیں گے۔" مجھے یقین ہے کہ یہ سفر میری زندگی کا یادگار سفر ہوگا اور اس کی ایک ایک بات مجھے یاد رہے گی۔"

نسرین نے کچھ سوچ کر کہا۔" پھر آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں آپ کو دیکھ کر پہچان نہیں سکوں گی۔"

"ارے... وہ تو مذاق تھا۔"

نسرین ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے اس کے معصوم چہرے میں ایک خاص قسم کی جاذبیت پیدا ہو جاتی تھی۔

باب ۔ ۹

لاہور پہنچ کر انہیں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سامان قلی کے حوالے کرنے کے بعد وہ ٹہلتے ہوئے ایک خالی پلیٹ فارم کی طرف نکل گئے۔ بیگم فریدہ احمد، یوسف سے اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے متعلق پوچھتی رہیں لیکن نسرین خلاف توقع خاموش تھی کیونکہ کراچی سے آنے والی گاڑی کچھ دیر سے پہنچی اس لیے انہیں جالندھر کی گاڑی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور وہ جالندھر کی گاڑی پہنچتے ہی اس پر سوار ہو گئے۔ یوسف نے کہا "دیکھو نسرین تم ابھی تک غصے میں ہو اور اب تو ہم گاڑی بھی بدل رہے ہیں"۔ نسرین نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ بیگم فریدہ احمد نے کہا "بیٹا... نسرین غصے میں نہیں ،صرف اداس ہے۔ اگر تمہارا جلدی خط نہ آیا تو اس کی اداسی گھر والوں کو بہت پریشان کرے گی۔ اگر تم اسے یقین دلا سکو کہ تم بہت جلد جالندھر آؤ گے اور اسے خط بھی لکھتے رہو گے تو اس کا موڈ بالکل ٹھیک ہو جائے گا"۔

یوسف نے نسرین سے پوچھا "کیوں نسرین تمہیں میرے اس وعدے پر یقین نہیں کہ میں جالندھر ضرور آؤں گا اور تمہیں خط بھی لکھتا رہوں گا۔ نسرین صرف یہ جواب دے کر خاموش ہو گئی۔ "بھائی جان، میں دعا کیا کروں گی کہ آپ ضرور آئیں"۔

یوسف نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی نیت سے اپنے گاؤں کی دلچسپ باتیں سنانی شروع کر دیں۔ نسرین کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، لیکن یہ مسکراہٹ دلکش قہقہوں میں تبدیل نہ ہو سکی، پھر اس نے کہا "نسرین میرے دل میں ایک اور بات ہے۔ جب میں

گھر جا کر یہ بتاؤں گا کہ جالندھر میں ایک چھوٹی سی شہزادی رہتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ امی جان بھی تمہیں دیکھنے کے لیے میرے ساتھ چلی آئیں گی۔ تم خوش ہو گی نا میری امی کو دیکھ کر....!"

"آپ سچ کہتے ہیں؟"

"میں تمہارے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، میں کوشش کروں گا کہ امی جان، میرے ساتھ ضرور آئیں"۔

"آپ امی جان کو یہ بھی کہیں گے نا کہ میری امی جان اور فہمیدہ آپا کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گی"۔

بیگم احمد نے کہا "بیٹا یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے اگر ہمیں یہ اطلاع ملی کہ آپ اپنی امی کے ساتھ جالندھر آ رہے ہیں تو میں ان کے استقبال کے لیے وہاں پہنچ جاؤں گی"۔

اس کے بعد مسز احمد اپنی بیٹی صفیہ اور اس کے شوہر نصیر کے متعلق باتیں کرتیں اور یوسف کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے متعلق مزید سوالات پوچھتی رہیں۔ امرتسر آگیا اور جب تک گاڑی وہاں کھڑی رہی۔ یوسف ان سے باتیں کرتا رہا۔ گفتگو کے دوران اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ نسرین نے اچانک کہا: "بھائی جان! میں خدا سے ایک دعا مانگتی ہوں"۔ "ابھی میں یہ دعا کر رہی تھی کہ آپ یہاں سے اترنے کا خیال بھول جائیں اور گاڑی چل پڑے پھر آپ کو اترنے کا خیال اس وقت آئے جب گاڑی دور جا چکی ہو پھر یہ خیال آیا کہ آپ تو چلتی گاڑی سے چھلانگ بھی لگا سکتے ہیں۔ میں نے اللہ سے توبہ کی اور آپ سے معافی مانگتی ہوں"۔

نسرین! یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ میں بھول جاتا تو مجھے خوشی ہوتی اور میں کبھی چلتی گاڑی سے چھلانگ نہ لگاتا"۔

گاڑی نے سیٹی بجائی اور نسرین نے کہا "بھائی جان گاڑی چل پڑی ہے"۔

"تم فکر نہ کرو" یوسف نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ماں جی! خدا حافظ"۔

"نسرین خدا حافظ اور آپ اپنی امی، ابو اور اپنی آپا کو بھی میرا اسلام کہیے گا۔"

"بھائی جان گاڑی تیز ہو رہی ہے" وہ چلائی۔

یوسف اطمینان سے سوٹ کیس سمیت نیچے اتر گیا اور پلیٹ فارم پر ایک نوجوان کھڑا تھا وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور یوسف سے لپٹ گیا۔

نسرین گاڑی سے سر نکالے آوازیں دے رہی تھی۔ بھائی جان، بھائی جان . . . ,,

یوسف نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا لیکن اسے یہ موقع نہ ملا کہ وہ دوسرے نوجوان کی گرفت سے آزاد ہو کر بھاگے اور اُس کی بات سُنے۔ البتہ اس نے منہ اس طرف کر کے بے بسی کی حالت میں اپنا ہاتھ ہلانا شروع کر دیا اور نسرین جسے اس نے باہر سر نکالے دیکھا تھا اس کی نگاہوں سے اُوجھل ہو گئی۔ اس نے تلملا کر کہا احمق آدمی میرا ہینڈ بیگ آگے چلا گیا ہے؟

"بھئی، اگر آوازیں دینے والی لڑکی تمہیں جانتی ہے تو تمہیں اپنے ہینڈ بیگ کے متعلق اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے . . . . اُسے آج ہی خط لکھ دو"۔

"یار منظور . . تم ہر بات، ہر کام بے وقت کرتے ہو"۔

"مَیں نہیں سمجھتا کہ اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز ہو گی لیکن اگر کوئی ایسی چیز ہے تو تم میرے ساتھ چلو جس اسٹیشن پر انہیں اترنا ہے میں اس کے اسٹیشن ماسٹر کو ریلوے پولیس کے دفتر سے فون کروا دوں گا۔ تمہیں صرف ان لوگوں کے متعلق بتانا پڑے گا جو لڑکی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ایک سب انسپکٹر میرا رشتہ دار ہے اور میں پچھلے ہفتے سے اس کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ آج تم بھی میرے پاس ٹھہرو گے اور وہ تمہارا بیگ وہیں منگوا دیں گے"۔

"یار، گولی مارو اپنے رشتہ دار کو مَیں نے امرتسر پہنچ کر اُن سے اجازت اس لیے نہیں لی کہ یہاں رُک جاؤں گا"۔

"بھئی میں تمہاری پریشانی دور کرنا چاہتا ہوں"۔

"مجھے کوئی پریشانی نہیں، اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی صرف ایک ایڈریس تھا جو وہیں رہ گیا"۔

"کس کا ایڈریس تھا؟"

"کسی کا تھا، تمہیں اس سے کیا"۔

"منظور نے گرم ہو کر کہا۔ "یوسف صاحب آج کچھ زیادہ ہی موڈ خراب ہے آپ کا"۔

"میرا موڈ بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم بتاؤ کہ دھاریوال کی طرف جانے والی گاڑی میں کتنی دیر ہے"۔

"یار اس میں کافی وقت ہے ہم اطمینان سے ڈائننگ روم میں جا سکتے ہیں"۔

"ورنہ ویٹنگ روم میں بیٹھتے ہیں"۔

"بھئی، بیٹھنا نہیں، ٹہلنا چاہتا ہوں"۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے"۔ منظور نے اس کا سوٹ کیس پکڑتے ہوئے کہا۔ "چلو میں تمہارا سوٹ کیس پہلے کہیں رکھوا دیتا ہوں اس کے بعد ہم کافی دیر گھوم سکیں گے"۔ یوسف اس کے ساتھ چل دیا۔ "سوڈا واٹر کے اسٹال پر منظور نے سوٹ کیس دکاندار کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "بھئی، ہمیں وِمٹو کی دو بوتلیں کھول دو اور اس سوٹ کیس کا خیال رکھو ہم کچھ دیر گھومنے کے بعد گاڑی پر سوار ہونے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ یوسف نے ایک بوتل پی کر گلاس رکھ دیا تو منظور نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس نے بوتل کھول کر گلاس میں انڈیل دی۔

"بھئی نہیں مجھے اور نہیں چاہیے . . . . یوسف نے کہا، لیکن منظور کے اصرار پر اس نے گلاس اٹھا لیا چند منٹ بعد وہ پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور یوسف کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد یوسف منظور سے بغلگیر ہو کر گاڑی پر سوار

ہو رہا تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ یوسف کے ساتھ اس نے بھاگتے ہوئے کہا "یار مجھے موقع ملا تو کسی دن تمہارے گاؤں آؤں گا۔"

"بھائی ضرور آؤ لیکن اس وقت گاڑی سے ذرا دُور رہو۔"

○

چند منٹ بعد نسرین جب اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کر رہی تھی۔ "ارے پگلی"! نانی نے کہا۔ "مَیں جانتی ہوں کہ جو لوگ بچوں کے ساتھ اتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یوسف کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن تم رو کیوں پڑی ہو؟ جو اتنا پیار کرتے ہوں ان کی یاد سے خوشی حاصل ہونا چاہیے۔"

نسرین نے ایک بیمار بچّی کی طرح کچھ کہے بغیر اپنا سر جھکا لیا۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

"نانی جان! نانی جان! اُدھر دیکھئے۔ جس بات سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔"

"کیا ہُوا؟" نانی اماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"نانی جان! اُدھر دیکھئے۔ وہ اپنا ایک بیگ یہیں چھوڑ گئے ہیں"، "پھر کیا ہُوا ہم ساتھ لے جائیں گے اور جب وہ آئے گا تو اُسے مل جائے گا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے"۔ "جس نوٹ بک میں مَیں نے اپنا ایڈریس لکھ کر دیا تھا وہ بیگ میں تھی اب وہ ہمارے پاس کیسے آئے گا؟ شاید اُسے میری کچھ باتیں یاد رہ گئی ہوں!"

"اچھا اُس نے تم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دیا تھا؟"

"نہیں نانی جان! اُس نے تو اپنے خط میں اپنا ایڈریس لکھ کر بھیجنا تھا۔"

"عجیب بے وقوف ہے وہ!"

"نہیں نہیں! نانی جان وہ بے وقوف نہیں تھا۔ میں بے وقوف تھی۔ یہ محسوس

کرتے ہوئے کہ غلطی ہو رہی ہے۔ مَیں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کیا غلطی ہو سکتی ہے؟"

"بیٹی اگر وہ احمق نہیں ہے تو میڈیکل کالج سے ایڈریس معلوم کر کے گھر تلاش کر لے گا۔ پھر وہ ایک ذہین لڑکا ہے اگر وہ ویسے بھی جالندھر پہنچ گیا تو کسی دقّت کے بغیر ہمیں تلاش کر لے گا۔ اگر اسے کسی کا نام یاد نہ رہا ہو تو بھی اسے اتنا تو معلوم ہے تمہارا ایک چچا فوج میں ڈاکٹر دوسرا پولیس انسپکٹر اور ایک یہاں ڈاکٹری کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گیا ہے۔"

نسرین قدرے اطمینان کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اُٹھ کر اُوپر سے بیگ اُٹھایا۔ اسے کھولا اور ضخیم نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا: دیکھئے نانی جان! اگر میں اسے کہتی کہ اس نوٹ بک پر اپنا ایڈریس بھی لکھ دو اور جانے سے پہلے وہ ورقہ پھاڑ کر وہ مجھے دے دیتا! تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ کتنی بے وقوف ہوں مَیں! پھر اُس نے صفحے اُلٹ کر دیکھا تو دائیں طرف کے چند صفحات پر "میرا بچپن" کے عنوان سے چند صفحات لکھے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے صفحے سے چند سطور پڑھیں۔ یہ الفاظ نہیں بلکہ محرک اور متحرک زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی تھیں۔

عام حالات میں وہ شور مچا دیتی۔ "نانی جان دیکھئے! اُس نے کیا لکھا ہے؟ ساری کاپی بھری ہوئی ہے نانی جان! یہ ایک کتاب ہے لیکن اب وہ بڑی مشکل سے اپنی زبان بند رکھنے اور دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نانی نے پوچھا۔

"بیٹی! اب بتاؤ۔ سیدھا میرے ساتھ لدھیانے چلو گی۔ یا تمہیں جالندھر تمہارے گھر چھوڑ کر جاؤں۔"

"دیکھئے نانی جان! بیس دن میں آپ کے ساتھ رہی ہوں۔ آپ اب اتنے ہی دن ہمارے گھر رہیں گی۔ اگر ہم پہاڑوں پر گئے تو آپ کو ساتھ جانا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ ابّا جان کو فرصت نہ ملے لیکن اگلے سال وہ ڈیرہ دون جانے کے پروگرام کو تبدیل نہیں کریں گے۔ یہ بھی

تو ممکن ہے کہ نانی جان اگلے سال شملہ جائیں اور آپ مجھے اور آپا فہمیدہ کو بلا لیں آپ یہ تو
کہہ سکیں گی کہ اپنی پیاری بچیوں کے بغیر میرا پہاڑوں پر جی نہیں لگے گا۔ اس سفر میں اگر فہمیدہ
آپا ہمارے ساتھ ہوتی تو آپ کتنا خوش ہوتیں۔ پھر ان کی موجودگی میں ہمیں یہ پریشانی تو نہ
ہوتی کہ وہ اپنے بیگ کے ساتھ ہمارا ایڈریس بھی چھوڑ گئے ہیں۔ نانی جان مجھے یقین ہے کہ اگر
فہمیدہ آپا ہمارے ساتھ ہوتیں تو یوسف بھائی ہمیں جالندھر پہنچا کر واپس جاتے یہ بھی ممکن تھا
کہ وہ دو دن ہمارے پاس گزارتے۔"

جالندھر اسٹیشن پر بیگم احمد نے قلی کو سامان اتارنے کے لیے کہا اور نسرین نے جلدی
سے بیگ اٹھا لیا۔ وہ گاڑی سے اُتر رہے تھے کہ ظہیر خان وہاں پہنچا اور اس نے نانی کو سلام
کرنے کے بعد سر جھکاتے ہوئے کہا۔"نانی جان ابا جان بھی آ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ نوکر بھی ہے۔"
نانی نے ظہیر کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔"بیٹا اب تو ہم نے قلی کو کہہ دیا ہے۔"
ایک قد آور آدمی جو سفید شلوار قمیص اور سر پر ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا مسافروں کو
اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے کہا" ماں جی! السلام علیکم۔ ہم سب نے آنا تھا
لیکن ان بادلوں کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ دوپہر سے تین چار بار بارش ہو چکی ہے اور اب بھی
ایسا نظر آتا ہے یہ بادل رات کو ٹوٹ کر برسیں گے۔"
نسرین نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا" ابا جی! وہ سیلاب
جس سے ہم گزرے تھے بڑا خوفناک تھا۔"
باپ نے اُسے اُٹھا کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور بیگم فریدہ احمد کی طرف متوجہ ہوتے
ہوئے کہا: "ماں جی! خالدہ، حسن علی اور عمر یہاں آئے تھے اور پرسوں واپس چلے گئے۔
اگر انہیں معلوم ہوتا کہ آپ سیلاب سے گزر کر آ رہی ہیں تو وہ رک جاتے۔"
"بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ میں شکارپور سے واپس نہیں چلی گئی ورنہ وہ یہ کہتے تھے کہ

شاید کئی مہینے ریلوے لائن اور سڑکیں بند رہیں گی۔"
"ماں جی! آپ نے بہت اچھا کیا۔"
چند منٹ بعد وہ تانگوں پر سوار ہو چکے تھے اور کوئی نصف گھنٹے بعد وہ تانگے سے
اتر کر ایک مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ بوندا باندی آہستہ آہستہ تیز ہو گئی۔ ڈیوڑھی میں
صفیہ ایک نوکرانی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بیگم فریدہ احمد کے ساتھ گلے لگ کر ملی۔ پھر اُس
نے جھک کر نسرین کو پیار کیا اور وہ بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ نانی نے کرسی پر بیٹھتے
ہوئے کہا: نصیر بیٹا! تمہارے گھر روشنی کیوں اتنی مدھم ہے؟"
نصیر نے پریشان ہو کر جواب دیا" ماں جی! روشنی تو اسی طرح کی ہے۔ اگر آپ کہیں
تو ایک بڑا بلب لگوا دیا جائے۔"
صفیہ نے کہا" ماں جی! روشنی پانچ منٹ میں تیز ہو جائے گی۔"
"بیٹی تو ٹھیک ہے نا!"
"امی جان میں بالکل ٹھیک ہوں"۔
فہمیدہ برابر والے کمرے سے نمودار ہوئی۔ "میں نماز پڑھ رہی تھی۔ نانی جان! آج
کافی دیر آپ کا انتظار کرتی رہی۔ پھر میں نے سوچا آپ کے آنے تک نماز پڑھ لیتی ہوں۔"
نانی نے اُٹھ کر اسے گلے لگا لیا اور پھر اس کا سر، اُس کی پیشانی، بڑی بڑی چمکدار
آنکھیں اور خوب صورت چہرہ چومنے لگی۔
"میری آنکھوں کی روشنی!" میں نے سیلاب عبور کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا
کہ میں کسی تاخیر کے بغیر تمہیں دیکھوں اور سفر کے دوران تم ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے
تھیں۔ نسرین اٹھو۔ اپنی بہن کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں وہاں سے
نہ ہلنا۔"
نسرین مسکراتی ہوئی اٹھ کر اُس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ ان کے والدین ہنسنے لگے اور

فہمیدہ کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے سرخ و سفید چہرے اور اس کی چمکدار آنکھوں سے قہقہے پھوٹ نکلے۔

بیگم فریدہ نے کہا" بیٹی صفیہ! خدا ان کو نظرِ بد سے بچائے یہ دونوں شہزادیاں ہیں ایک چھوٹی اور ایک بڑی۔ اور جب میری تھکاوٹ دُور ہو جائے گی تو مَیں تمہیں اطمینان سے بتاؤں گی کہ میرے دماغ میں شہزادیوں کا خیال کیوں آیا ہے۔

"فہمیدہ! آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ"

فہمیدہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور نانی نے اس کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا:

"بیٹی! مَیں بہت اداس ہو گئی تھی تمہارے بغیر۔ تمہیں شہزادی کہلانا پسند ہے نا!"

نانی جان! اس نے جواب دیا۔ "مَیں صرف ایک بیٹی ہوں۔ آپ کی، امی کی اور ابو کی"

بیگم فریدہ بولی" بیٹی! تمہاری آواز، تمہارا قد و قامت، تمہارے ہاتھ، تمہارے بازو، تمہارے پاؤں اور تمہاری آنکھیں دیکھنے والے تمہیں، ہمیشہ ایک شہزادی سمجھیں گے"

فہمیدہ نے پریشان ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنی ماں سے کہا" امی جان! نانی جان کو بھوک لگی ہو گی، کھانا لگا دوں"

"ہاں بیٹی! لگا دو"

جب وہ کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو نصیر نے کہا "ماں جی! مَیں نے کبھی غور نہیں کیا لیکن آپ کی باتوں سے مجھے بھی یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ایک غریب آدمی کے گھر شہزادیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

اور اگر خالدہ بہت بڑی نہ ہو چکی ہوتی تو میں کہتا، خالدہ ہماری بڑی شہزادی ہے"

صفیہ نے کہا" امی جان! ان کے لیے دعا کیا کریں"

"بیٹی! مَیں ہر سانس کے ساتھ ان کے لیے دعا کیا کرتی ہوں۔ فہمیدہ جتنی مجھے پیاری لگتی ہے اُسی قدر مجھے اس کی فکر رہتی ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کے لیے میری بہت

سی دعائیں قبول ہونے والی ہیں۔ دیکھو! نسرین سفر کے جو حالات بیان کرے انہیں اطمینان سے سننا، اُسے جھڑک نہ دینا"

کھانا کھانے کے بعد نسرین اور فہمیدہ بالاخانے کے ایک کمرے میں چلی گئیں، بارش اب تیز ہو چکی تھی اور کھڑکیوں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ نسرین نے کہا:

"آپا جان! اگر مَیں نے باتیں شروع کر دیں تو آپ کو نیند نہیں آئے گی۔ اس لیے آپ سو جائیں۔ میں اطمینان سے آپ کے ساتھ بڑی دلچسپ اور بڑی لمبی باتیں کرنا چاہتی ہوں"

"دیکھو نسرین! کئی دن میں تمہاری آواز نہ سننے کے باعث اداس ہو گئی تھی۔ اب تم جب تک چاہو، بولتی رہو۔ سکھر سے ابا جان کو فون پر بتایا گیا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک بہادر اور قابلِ اعتماد آدمی نے سیلاب عبور کیا ہے اور امرتسر تک تمہارا ساتھ دے گا جس کی مجو علی اور اُس کی بیوی نے تعریف کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ امرتسر تک وہ تمہارے ساتھ سفر کرے گا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اگر وہ اتنا اچھا تھا تو نانی جان اسے ساتھ کیوں نہیں لائیں۔ ہمیں شکریہ کا موقع تو ملنا چاہیئے تھا"

"نسرین بولی: آپا جان حیرت تو آپ کو اس وقت ہو گی جب آپ میری باتیں سنیں گی، مجھے اس بات کا کم افسوس نہیں کہ مَیں بھائی یوسف کو یہاں نہیں لا سکی۔ سارے سفر کے دوران مَیں یہ سوچتی رہی کہ کاش آپ میرے ساتھ ہوتیں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتیں

پھر نسرین نے ابتداء سے آخر تک کے واقعات سنا دیئے۔

دُوسرا حِصّہ

مہکتی خاک اور ٹھنڈی نہریں

باب - ۱۰

رات دو بجے کے قریب یوسف گاڑی سے اُترا تو اسٹیشن پر چند آدمی جو اُسے لینے آئے ہوئے تھے۔ اُس کے گرد جمع ہو گئے کوئی اُس سے مصافحہ کر رہا تھا اور کوئی بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایک لمبے تڑنگے سکھ نوجوان نے آگے بڑھ کر فوجی طریقے سے اسے سیلوٹ کیا۔ یوسف نے اُس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ " ارے بہادر سنگھ! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" بہادر سنگھ نے جواب دیا: "جی کل آوارہ گردی کرتے ہوئے تمہارے گاؤں جا نکلا تھا وہاں سے معلوم ہوا کہ تمہارے آدمی دو دن سے رات کی گاڑی دیکھنے جاتے ہیں۔ اِس لیے آج میں بھی یہاں آ گیا۔ "تم نے بہت پریشان کیا سب کو اگر کوئٹہ میں رک گئے تھے تو تار بھیج دیا ہوتا"

یوسف نے جواب دیا، "شاید دریائے سندھ کا بند ٹوٹ جانے سے جو سیلاب آیا ہے، تم نے اُس کے متعلق نہیں سنا"۔

"یار وہ تو میں نے سنا ہے لیکن سیلاب تو کہیں شکارپور کے پاس آیا ہے"۔ یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی کوئٹہ سے آتے ہوئے شکارپور سے گزرنا پڑتا ہے اور شکارپور سے آگے ریلوے لائن ٹوٹ گئی تھی۔ اب بتاؤ فوج میں کب بھرتی ہوئے تھے"۔

"بھائی صاحب میں فوج میں بھرتی نہیں ہُوا۔ بھگوان کی کرپا سے مجھے پولیس میں نوکری مل گئی ہے۔

چودھری صاحب نے بھی میری بڑی مدد کی تھی وہ یہ کہتے تھے کہ تم بہت جلد اے ایس۔ آئی ہو جاؤ گے"۔

ایک آدمی نے یوسف کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور اُس نے بہادر سنگھ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "اچھا بہادر سنگھ! بہت بہت شکریہ تم نے بڑی تکلیف کی۔ اب اپنے گھر جا کر آرام کرو۔

جب تم ڈیوٹی پہ جاؤ گے تو مَیں تمہیں رخصت کرنے آؤں گا" بہادر سنگھ نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"تمہارے آنے کی خوشی مجھے نوکری مل جانے سے کم نہیں ہوگی۔ آج میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی سلام کرنے گیا تھا۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں"

"میں بھی انہیں بہت یاد کرتا ہوں" یوسف نے جواب دیا۔



گاؤں میں داخل ہونے کے بعد یوسف نے ایک نوجوان سے اپنا سوٹ کیس پکڑتے ہوئے کہا: "بھئی اب تم سب جا کر آرام کرو"

وہ سب منتشر ہوگئے اور یوسف حویلی کی ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔

سب سے پہلے اس کی والدہ نیم وا دروازے سے باہر نکلیں اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا سر جھکا لیا۔ ماں نے اُس کا سر پکڑ کر اُس کی پیشانی آنکھوں اور گالوں پر بوسے دیئے۔ پھر دادی اور چچی اُس سے پیار کرنے لگیں۔

چھوٹے بھائی محمد صدیق نے اُس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لیتے ہوئے کہا "بھائی جان! مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں نا!" یوسف نے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "صدیق! جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو ہم اکٹھے جایا کریں گے اور امی جان بھی ہمارے ساتھ ہوا کریں گی۔ اب اگر میں تمہیں ساتھ لے جاتا تو امی جان کے پاس کون رہتا؟"

صدیق نے کہا "بھائی جان، عائشہ آدھی رات تک آپ کا انتظار کر کے سو گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ جب بھائی جان آئیں تو مجھے جگا دینا"

"نہیں اُسے سونے دو اور تم بھی سو جاؤ"

قدسیہ یہ کہہ کر یوسف کی طرف متوجہ ہوئی "بیٹا۔ میرا خیال ہے کہ سفر کرنے والوں کی نسبت انتظار کرنے والوں کو زیادہ تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ میں ساری رات تمہاری خیریت کی دعائیں مانگا کرتی تھی اور مجھے دن کے وقت بھی نیند نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی جی میں آتا تھا کہ میں اُڑ کر کوئٹہ پہنچ جاؤں۔ بیٹا! تم نے اِتنے دن میرے بغیر کیسے گزار لیے"

یوسف نے جواب دیا۔ "امی جان۔ مجھے معلوم نہیں کہ اِتنے دن کیسے گزر گئے لیکن مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے آپ کی یاد سے بھی ایک سکون ملتا تھا۔ آپ جس قدر میری آنکھوں سے دُور ہوتی ہیں اِتنا ہی میرے دل کے قریب ہوتی ہیں میں تصور میں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آپ کو دیکھا کرتا تھا۔ آپ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ امی جان! اب آپ سو جائیں کل مَیں آپ کو بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا"

"بیٹا! میرے لیے تمہاری ہر بات دلچسپ ہوتی ہے اور مَیں یہ چاہتی ہوں کہ تم بولتے رہو اور میں سنتی رہوں۔ تمہاری باتوں سے میری ساری تھکاوٹ دور ہو جائے گی اور وہ غصہ بھی جاتا رہے گا جو مجھے دو دن سے تم پر آ رہا ہے"

"امی جان" یوسف نے کہا "آپ کا غصہ اُتارنے کے لیے میرے پاس ایک بہت اہم چیز تھی۔ مَیں حیران ہوں، کہ آپ کو دیکھنے کے بعد وہ میرے ذہن سے کیسے نکل گئی" یوسف بھاگتا ہوا نیچے گیا اور دو منٹ بعد اس نے ایک ریشمی رومال میں لپٹی ہوئی عطر کی شیشی ماں کو دیتے ہوئے کہا۔ "امی جان عطر کی یہ شیشی اور ریشمی رومال اس خاتون کا تحفہ ہے جسے پہلی بار دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ آپ کی شکل و صورت کے اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور میں نے پہلی ملاقات میں ہی اسے ماں جی کہنا شروع کر دیا! گلاب کا یہ عطر یقیناً بہت اچھا ہوگا اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ مَیں گھر پہنچتے ہی آپ کو پیش کر دوں گا۔ امی جان، اس معزز خاتون کے ساتھ ایک شہزادی بھی تھی"

ماں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کیا لگتی تھی وہ اس کی ؟"

"جی امی جان . . . وہ اس کی نواسی تھی۔ اگر آپ اس کو دیکھ لیں تو آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ ایک شہزادی کے سوا کچھ اور ہو سکتی ہے"۔

"بیٹا ! جس خاتون کو تم نے دیکھتے ہی ماں کہہ دیا تھا اس کی یقیناً نواسی کوئی شہزادی ہو گی . . . کیا عمر تھی اس کی ؟"

"امی جان وہ چھوٹی جماعت میں پڑھتی ہے لیکن بہت ہوشیار ہے"

"بیٹا میں پوچھ رہی ہوں عمر کیا تھی ؟"

"یہی کوئی دس گیارہ سال کی ہو گی، میں نے ان سے کہا تھا کہ میری امی جان تمہیں دیکھنے کے لیے کسی دن جالندھر آئیں گی۔ امی جان اس کی نانی کہتی تھیں۔ اس شہزادی کی بڑی بہن فہمیدہ بھی ایک شہزادی ہے۔ امی جان مجھے یقین ہے کہ آپ ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں گی"

ماں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے اور یوسف کو کوئٹہ میں قیام اور اس کے بعد امرتسر تک سفر کے تمام واقعات بیان کرنے پڑے۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ ماں نے کہا "بیٹا خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شہزادی جسے تم نے نہیں دیکھا میرے ان سپنوں کی تعبیر ہو گی جو میں ایک مدت سے دیکھا کرتی تھی۔ میں ان کے گھر ضرور جاؤں گی۔ تم صبح ہوتے ہی انہیں خط لکھ دو کہ میری ماں کو شہزادیاں دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے ہم آپ کی طرف سے خط کا جواب ملتے ہی جالندھر پہنچ جائیں گے"

یوسف نے کچھ سوچ کر کہا "امی جان، میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میرا جو بیگ گاڑی میں رہ گیا تھا۔ اس کا ایڈریس اس کے اندر تھا مجھے صرف یہی یاد ہے کہ ان کی نانی کا نام بیگم فرید احمد تھا، نواسی کا نام نسرین تھا۔ نانی لدھیانہ میں رہتی ہیں اور نسرین کے والدین جالندھر میں رہتے ہیں"

"اور فہمیدہ بھی جالندھر میں . . . ؟"

"جی ہاں اور کہاں ہو گی"

ماں نے کچھ سوچ کر کہا "ارے بیٹا یہ کون سا ایسا معمہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔ جب انہوں نے تمہیں اپنا ایڈریس دیا تھا تو تم نے بھی انہیں اپنا ایڈریس ضرور دیا ہو گا اور اگر وہ اتنے اچھے لوگ ہیں جتنا تم بیان کرتے ہو اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا ایڈریس تمہارے تھیلے میں پڑا ہوا ہے وہ بہت جلد تمہیں خط لکھیں گے"

یوسف نے کہا "امی جان یہی ایک حماقت تو مجھ سے ہوئی تھی کہ میں نے اپنا ایڈریس انہیں نہیں دیا۔ دادا جان مرحوم کہا کرتے تھے ہر بات میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے اگر ان سے ملنے میں ہماری کوئی بہتری ہے تو وہ ہیں اور ہم انہیں تلاش کر لیں گے"

"ہاں بیٹا یہ کوئی مشکل بات تو نہیں تم کوئٹہ میں ان کے رشتہ داروں کو جانتے ہو اور جالندھر میں جس خاندان کا لڑکا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گیا ہے اسے بڑی آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے"

"امی جان ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب مجھے اپنی تعلیم سے فرصت ملے گی ہم دونوں جگہ جگہ سیر کے لیے جایا کریں گے اور میرا پہلا کام یہ ہو گا کہ میں آپ کے ساتھ جالندھر جا کر انہیں تلاش کروں"

"اچھا بیٹا ! اب تم اپنی چارپائی گھسیٹ کر برآمدے میں لے جاؤ اور نماز پڑھ کر اطمینان سے سو جاؤ۔ جب تک تمہاری نیند پوری نہیں ہو گی میں کسی کو اوپر نہیں آنے دوں گی۔ پریشان تو میں بہت ہوتی ہوں کہ تم اُن کا پتہ اپنے تھیلے میں چھوڑ آئے ہو، لیکن مجھے اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت نظر آتی ہے"

○

یوسف گہری نیند سے بیدار ہوا تو اس کی چھوٹی بہن عائشہ اس کے بستر کے قریب کھڑی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے کہا "السلام علیکم بھائی جان ! میں دو بار آپ کو جگانے کے لیے آئی ہوں۔ اگر اب بھی آپ اچانک کروٹ بدل کر آنکھیں نہ کھولتے

تو میں آپ کی نیند خراب کرنے کی جرأت نہ کرتی۔ بھائی جان! آپ یہیں منہ دھولیں تولیہ صابن اور باقی سب کچھ میں نے یہاں رکھ دیا ہے اور آپ کے لیے صاف کپڑوں کا جوڑا بھی کرسی پر پڑا ہے۔ مَیں جا کر انہیں کہتی ہوں کہ بھائی جان لباس تبدیل کر رہے ہیں۔ آپ کا بڑی دیر سے انتظار ہو رہا ہے۔"

"بھئی کون انتظار کر رہا ہے میرا؟"۔ یوسف اٹھا اور لوٹا اٹھا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

"جی وہی چھوٹے گاؤں والے۔ میرا مطلب ہے امینہ، اس کی امی اور ان کی ایک رشتہ دار —— ان کا نوکر ہر روز آپ کا پتہ کرنے آتا تھا اور وہ بھی امی جان کے پاس ہر دوسرے تیسرے دن آجایا کرتی ہیں۔ امینہ کی ماں کہتی تھیں میری بیٹی کو کھلی ہوا بہت پسند ہے۔ اِس لیے برسات کے دن وہ یہیں گزارنا چاہتی ہے۔ چھٹیاں بھی ہوتی ہیں نا بھائی جان برسات میں، اِس لیے۔ اچھا بھائی جان! مَیں نیچے جاتی ہوں۔ آپ جلدی آئیں ورنہ مجھے دادی جان کی ڈانٹ ڈپٹ سننا پڑے گی۔ وہ گھر میں سب سے ناراض ہیں کہ جب آپ آئے تھے تو انہیں اُسی وقت کیوں نہیں بتایا گیا۔ وہ بھی دو مرتبہ آپ کو دیکھ کر گئی ہیں۔"

دس منٹ بعد یوسف نیچے پہنچا۔ ایک طرف وسیع دالان کے سامنے کشادہ برآمدے میں اس کی والدہ، دادی، چچیوں کے پاس رشیدہ، اس کی بیٹی امینہ اور چراغ بی بی بیٹھی ہوئی تھیں۔ رشیدہ ایک ہٹی کٹی اور خوب کھانے والی جفاکش قسم کی عورت تھی۔ یوسف نے اُسے سلام کیا اور اُس نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹے! بیٹھ جاؤ۔ قدسیہ بہن، ان کا ناشتہ یہیں منگوا لو۔"

"بہن اب تو کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ کچھ دیر باتیں کریں۔ یوسف بیٹا تم دودھ پیو گے یا لسی؟"

یوسف نے کہا۔ "عائشہ میرے لیے لسی کا ایک گلاس لے آؤ نمک ڈال کر۔" پھر وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے امینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ یہاں آئے اور مَیں

یہاں گھر میں موجود تھا مگر مجھے اطلاع ابھی ابھی ہوئی اِس لیے مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔"

"جی ہاں۔ گرمیوں کی ساری چھٹیاں یہیں گزارنی ہیں اور اگر کسی اور طرف نہ نکل گئے تو انشاء اللہ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ ہمارے نوکر نے صبح اطلاع دی تھی کہ آپ آ گئے ہیں اور امی جان آپ کو پوری فیملی کے ساتھ کھانے کی دعوت دینے چلی پڑی ہیں! ابا جان چند دن کے لیے امرتسر اور لاہور چلے گئے ہیں ورنہ وہ خود یہاں آتے۔ چچی جان نے ہمیں یہ جواب دیا ہے کہ وہ آپ سے مشورہ کیے بغیر ہماری دعوت قبول کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکتیں"

یوسف مسکرایا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ امی جان کا ہر فیصلہ میرے لیے حکم ہوتا ہے"!

امینہ مسکرائی "یہ ہمیں معلوم ہے۔ لیکن آپ کے ہونے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے"

امینہ کھلتے ہوئے سانولے رنگ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ایک صحت مند لڑکی تھی۔ اِس وقت اِس کا قد و قامت بھی موزوں دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے ہاتھ اس کے جسمانی تناسب سے قدرے چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ یوسف کی نگاہ اس کے ہاتھوں پر اِس لیے پڑ گئی تھی کہ اس نے ناخن ذرا بڑھا رکھے تھے اور ان پر سرخ پالش چڑھا رکھی تھی۔ یوسف کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

امینہ بولی۔ "یوسف صاحب فرمائیے دعوت کے لیے آپ کا موڈ کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟"

"آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ امی جان کی کسی خواہش کے مقابلے میں میرے موڈ کے کوئی معنے ہو سکتے ہیں؟"

امینہ کی ماں بولی "واہ بھئی آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ آپ کی امی آپ کو کتنا چاہتی ہیں اور آپ کے موڈ کو کس قدر اہمیت دیتی ہیں"۔

یوسف نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری امی جان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا ہر اشارہ میرے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے، اگر وہ ابھی کہہ دیتیں کہ آج دوپہر کے وقت

آپ کے ہاں دعوت ہے تو میرا موڈ اُسی وقت بن جاتا ہے۔"

رشیدہ نے ہنستے ہوئے کہا "نا بھئی اتنی جلدی نہ کرو وہ جس جگہ رہتے ہیں، دعوت کرنا آسان نہیں۔"

امینہ نے کہا "یوسف صاحب یہ بات پکی ہو گئی کہ دعوت کی تاریخ پر ہمیں آپ کے موڈ کے متعلق کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ اور ابا جان کے واپس آتے ہی ہم آپ سب کی دعوت کریں گے۔"

"جی ہاں طے ہو گیا۔" یوسف نے جواب دیا۔

یوسف کی چچی نے کہا "بیٹا! تم نے چراغ بی بی سے کوئی بات نہیں کی، وہ امینہ کے ماموں کی بیٹی ہے۔ ہمیں رشیدہ اور امینہ تو کبھی کبھی ملا کریں گی۔ وہ زیادہ تر اپنے گاؤں میں ہی رہا کرے گی۔"

یوسف کی ماں نے کہا "بیٹا! چراغ بی بی کے باپ نے میاں عبدالکریم کے کئی اور کاموں کے علاوہ ان کی زمین کا انتظام بھی سنبھال لیا ہے اور سنا ہے کہ میاں صاحب مزید زمین خریدنے کی فکر میں ہیں۔"

یوسف نے کہا "امی جان! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے ہمیں ایک طاقت ور ہمسایہ مل جائے گا۔"

یوسف کی دادی صحن سے نمودار ہوئی اور اس نے کہا "اری لڑکیو! مہمانوں کو کچھ کھلاؤ پلاؤ گی بھی یا باتیں ہی کرتی رہو گی۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا "دادی جان! آپ کے مہمان بھوکے نہیں رہیں گے۔"

دادی نے اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹا! اللہ تمہیں بہت عزت اور بہت ترقی دے۔ میں نے ان سب سے جھگڑا کیا تھا کہ جب بیٹا آیا تھا تو تم نے مجھے

بلایا کیوں نہیں تھا۔"

"دادی جان! میں نے آتے ہی کہا تھا کہ دادی جان کی نیند خراب نہ کی جائے۔"

"مکار کہیں کا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں کتنی بار یہ پوچھ چکی ہوں کہ تم بیدار ہوتے ہو کہ نہیں۔"

"دادی جان! آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا۔"

"اور میں تمہاری نیند کیوں خراب کرتی۔"

"دادی جان! تھوڑی سی نیند خراب ہوتی اور اس کے عوض مجھے آپ سے سیکڑوں دعائیں ملتیں۔"

"اچھا تمہارا خیال ہے کہ تمہاری نیند خراب کیے بغیر میں تمہیں دعائیں نہیں دیتی۔" "دادی جان میں یہ تو نہیں کہتا لیکن آپ کی جو دعائیں میں نیم خوابی کی حالت میں سنا کرتا تھا وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔"

دادی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا "قدسیہ بیٹی، تمہاری یہ بات بالکل صحیح ہے کہ تمہارے بیٹے کی پیشانی پر روشنی دکھائی دیتی ہے۔" امینہ نے اُٹھ کر کہا "دادی جان! آپ میرے پاس بیٹھ جائیں۔"

"رشیدہ! تمہاری لڑکی بڑی ذہین ہے۔" دادی نے امینہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "اسے معلوم تھا کہ میں اس کے سوا کسی کے قریب نہیں بیٹھوں گی۔ مجھے بہت پیاری لگتی ہے یہ۔"



تھوڑی دیر بعد وہ کمرے کے اندر وسیع دستر خوان کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جسے دیہاتی معیار کے مطابق کافی پر تکلف سمجھا جاتا تھا۔ کھانے میں میٹھے کی جگہ آموں سے بہتر کوئی چیز نہ تھی اور یوسف کا چچا غلام نبی علاقے کے باغات سے بہترین پودوں سے چوسنے والے آموں کا ایک ٹوکرا اٹھوا لایا تھا۔

جب مہمان خواتین جانے کے لیے اُٹھیں تو دادی نے کہا "یوسف جاؤ ان کو ان کے

گاؤں تک چھوڑ آؤ۔"

یوسف نے جواب دیا۔" دادی جان، مجھے کچھ تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر آپ حکم دیتی ہیں تو چل پڑتا ہوں ورنہ شاید تھوڑی دیر اور سونے سے میری طبیعت ٹھیک ہو جاتے۔"

"ارے بیٹا! تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم بالاخانے میں جا کر گرمی میں سو جاؤ۔ تپش لگ گئی ہے میرے چاند کو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔ میں نائن اور اس کے بیٹے کو ان کے ساتھ بھیج دیتی ہوں۔"

یوسف نے کہا" اوپر والا کمرہ ہوادار ہے۔ میں ہوادار علاقوں سے گھوم کر آیا ہوں۔ نیچے گھٹن میں مجھے نیند نہیں آئے گی۔ اگر آپ حکم دیں تو میں باہر باغ میں چلا جاتا ہوں۔"

"بیٹا! جہاں چاہتے ہو جاؤ لیکن سو جاؤ۔ لڑکیو! تم کیا دیکھتی ہو۔ جاؤ نا اس کا سر دباؤ۔ گھر میں کدو کا روغن ہوگا۔ اس کی مالش کر دو۔"

"دادی جان! میں سونے سے بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اچھا جاؤ نا جلدی کرو۔ قدسیہ بیٹی! یہ کسی اور کی نہیں مانے گا۔ تم اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر کدو کے روغن کی مالش کرو۔"

قدسیہ نے کہا" آؤ بیٹا! تمہاری دادی پریشان ہو رہی ہیں۔"

یوسف نے کہا" مہمانوں کو تو رخصت ہو لینے دیں۔ دادی جان۔"

یوسف کی چچیاں اور خاندان کی دوسری عورتیں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہی تھیں۔

"آؤ" دادی نے مہمانوں کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

وہ دادی کے پیچھے چل پڑیں باقی خواتین نے باہر کی ڈیوڑھی تک ان کا ساتھ دیا۔

وہ ڈیوڑھی میں باتیں کر رہی تھیں کہ نوکر نائن اور اس کے بیٹے کو لے کر پہنچ گیا اور وہ دادی کے بعد باری باری سب سے مل کر رخصت ہوتے۔ دادی واپس آئیں تو قدسیہ سیڑھیوں سے

نیچے اتر رہی تھی۔

"ارے بیٹی! تمہیں کیا جلدی پڑی ہے میں نے کہا تھا۔ اس کے سر پر کدو کے روغن کی مالش کرو۔"

قدسیہ نے کہا" ماں جی وہ سو گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔" بیٹی! تم نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ کہیں بخار تو نہیں تھا اُسے۔"

"ماں جی۔ اگر یوسف کو بخار ہو تو مجھے اچھی طرح دیکھے بغیر بھی معلوم ہو جاتا ہے آپ بالکل فکر نہ کریں۔ جب وہ بیدار ہوگا قہقہے لگاتا ہوا آپ کے پاس آئے گا۔"

"اچھا میں جا کر دعا کرتی ہوں۔"

دادی یہ کہہ کر یوسف کے چچا معین الدین کے گھر چلی گئیں۔

عصر کی نماز کے بعد قدسیہ اوپر گئی تو یوسف لیٹے لیٹے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ ماں اس کے قریب بیٹھ گئی اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ یوسف نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہیں اور آپ کسی بات پر بہت خوش ہیں۔"

"تمہاری دونوں باتیں صحیح ہیں بیٹا! میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم ان کے ساتھ نہیں گئے۔ خدا معلوم مجھے ان لوگوں سے کیوں الجھن محسوس ہوتی ہے۔"

"امی جان" یوسف نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔" اگر آپ کی الجھن کا باعث وہ لڑکی ہے تو یہ الجھن ہمیشہ کے لیے دُور ہو جانی چاہیے لیکن میں حیران ہوں کہ آپ نے جلدی ان کی دعوت قبول کیوں کر لی۔"

"بیٹا! اگر میں دعوت قبول نہ کرتی تو دادی اماں فوراً ایسا فیصلہ سُنا دیتیں جو تمہارے اباجان کے خیالات کی تائید میں ہوتا اور پھر میں کچھ نہ کر سکتی۔"

"ابا جان کے خیالات امی جان ......"

"بیٹا! میں یہ جانتی ہوں کہ وہ عبدالکریم کی دولت سے کتنے مرعوب ہیں، جس زمین کا ذکر تم نے آج سنا ہے اس کے متعلق تمہارے ابا جان کو تین ماہ سے معلوم تھا۔ وہ ایک دفعہ انہیں امرتسر اپنے گھر بھی لے گیا تھا اور دس دن کی چھٹی میں سے انہوں نے تین دن وہاں گزارے تھے اور گھر آکر اس کی شاندار دعوتوں کی بے حد تعریف کی تھی۔ ان کے جگہ جگہ پھیلے ہوتے کاروبار کا وہ اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے بھٹوں کی تعداد کتنی ہے اور ان سے کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ تمہارے ابا جان کو وہ لاہور میں دو وسیع پلاٹ بھی دکھا چکے ہیں۔ جہاں دو عالی شان کوٹھیاں تعمیر ہونے والی ہیں ایک امینہ کے لیے اور دوسری اس کے بھائی کے لیے۔ بیٹا! مجھے اس بات سے خوف آتا ہے کہ ہمارے خاندان کے لوگ کہیں تمہیں جکڑ کر ان کے آگے نہ ڈال دیں۔ تمہاری دادی جان سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ وہ تم سے بے حد پیار کرتی ہیں اور ابھی تم نے ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ انہوں نے تمہاری منگنیاں شروع کر دی تھیں۔ انہیں اتنی لڑکیاں پسند آئی تھیں کہ میں تعداد بھی نہیں بتا سکتی۔ لیکن جب انہیں یہ بتا دیا جائے کہ یوسف کا اس میں فائدہ نہیں تو وہ فوراً اپنی سوچ کا رخ بدل لیتی ہیں۔ لیکن تمہارے ابا جان سے میں بہت ڈرتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسی صورت حال پیدا کر دیں کہ تم جانتے اور سمجھتے ہوئے کوئی غلط فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔"

"امی جان! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ابا جان مجھ پر کوئی غلط فیصلہ نہیں ٹھونس سکتے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"بیٹا! جب تک میں زندہ ہوں انشا اللہ کوئی ایسا خطرہ پیش نہیں آئے گا لیکن مجھے سوچتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے کہ کسی دن تمہیں تنہا ایسے حالات کا مقابلہ نہ کرنا پڑے جو اس وقت تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتے۔"

"امی جان! آپ ایسی باتیں کیوں کہتی ہیں۔" یوسف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ماں

کی گود میں سر رکھ کر ایک بچے کی طرح سسکیاں لینے لگا: "اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رکھے۔ امی جان آپ کو یہ سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ جب میں آپ کے سایے سے محروم ہو جاؤں گا تو میں زندہ رہنا پسند کروں گا۔"

ماں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا "ارے! میرا شیر بیٹا رو رہا ہے۔ میں کتنی بے وقوف ہوں میں نے کیسی بات کہہ دی ہے۔ بیٹا! تمہارے ساتھ ہزار برس زندہ رہ کر میں دعا کروں گی یا اللہ مجھے اور زندگی دے۔ اب تم مطمئن ہو۔"

یوسف نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

باب ۔ ۱۱

چوتھے روز یوسف مغرب کی نماز کے بعد گاؤں سے باہر سیر کے لیے نکل گیا۔ اچانک مکئی اور کماد کے کھیتوں کی اوٹ میں پگڈنڈی سے ہردیال سنگھ اس کا بیٹا جگجیت سنگھ اور چراغ بی بی نمودار ہوتے اور وہ انہیں دیکھ کر رک گیا۔ ہردیال سنگھ جس کی عمر بیالیس سال سے اُوپر تھی۔ عبدالکریم کا مزارع تھا اور عبدالکریم کی جائداد کی دیکھ بھال میں اسے قائم دین کے ساتھ ایک ثانوی پوزیشن حاصل تھی۔ اس کا بیٹا جگجیت سنگھ عبدالکریم کی بیوی کو ماں جی امینہ کو آپا کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا تھا اور اُسے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے عوض صاف ستھرے کپڑے ملتے تھے۔ ہردیال سنگھ پسینے سے شرابور ہو کر بری طرح ہانپ رہا تھا۔ چراغ بی بی چند قدم پیچھے تھی اور بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کر رہی تھی۔ ابھی ہردیال سنگھ بات کرنے کے لیے اپنی سانس درست کر رہا تھا۔ کہ اُس نے قریب آکر روتی آواز میں کہا "چوہدری یوسف جی ہمیں بچائیے جگجیت سنگھ سے پوچھ لیجیے۔ ڈاکو آج رات ہمیں قتل کرنے اور لوٹنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جگجیت سنگھ نہر کے کنارے درخت کے اُوپر چڑھ کر جامن اتار رہا تھا۔ ہمارے دشمن اور وہ ڈاکو ارجن سنگھ وہاں آگئے اور یہ خوف کے مارے چھپ گیا۔"

یوسف نے سرہلا کر کہا "تم یا تو رو لو یا بات کر لو۔ یہ جامن کے ساتھ ڈاکوؤں کا کیا تعلق ہے اور چھپ کون گیا تھا؟"

چراغ بی بی نے دردناک آواز میں کہا "وہ ہمیں قتل کر دیں گے اور رات ہوتے ہی ہمارے گھر پر حملہ ہو جائے گا۔ مجھے امینہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ابا شہر گیا ہوا ہے اور فضل دین

خدا جانے کہاں غرق ہو گیا ہے۔ میاں جی نے آج آنا ہے۔ خدا کرے وہ شام تک پہنچ جائیں لیکن آپ جگجیت سے پوچھ لیں کہ ڈاکو کتنے خطرناک ہیں!"

چراغ بی بی پھر رو رہی تھی۔ یوسف نے کہا۔

"اب تم خاموش ہو جاؤ اور سیدھی ہمارے گھر چلی جاؤ اور وہاں کسی سے یہ بات نہ کرو کہ ہمارے گھر ڈاکہ پڑنے والا ہے۔ رونے کے لیے پیٹ درد یا سر درد کا بہانہ کر لینا۔ لیکن ڈاکوؤں کا ذکر نہ کرو۔ سُن لیا تم نے"

"جی نہیں کروں گی میں ڈاکوؤں کا ذکر۔"

"اچھا جگجیت، تم بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

جگجیت بولا "جی، چھوٹی بی بی جی کو جامن بہت پسند ہیں اور میں نہر کے قریب ایک درخت پر چڑھ کر جامن توڑ رہا تھا کہ مجھے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ ہمارے گاؤں کے دو آدمی گنگا سنگھ اور بشن سنگھ آموں کے باغ کی طرف سے نکل کر اس درخت کی چھاؤں میں رک گئے جس پر میں جامن توڑ رہا تھا، سوار نے گھوڑا روک کر اترتے ہوئے کہا۔ میرا خیال ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" میں نے تو انہیں دُور سے دیکھ کر ہی پہچان لیا تھا—— وہ ارجن سنگھ ڈاکو تھا جب وہ بیٹھ گئے تو ارجن سنگھ بولا "گنگا سنگھ! میرے چار آدمی رات ہوتے ہی تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم نے اپنے بال بچوں کو اندھیرا ہوتے ہی بشن سنگھ کے گھر بھیج دینا ہے اور یہ بھی پتہ کر چھوڑنا کہ آج عبدالکریم واپس اپنے گھر آگیا ہے یا نہیں اور ان کی حویلی کے اندر کتنے آدمی ہیں اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں کون سی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔" اُس ڈاکو کو یہ بھی معلوم تھا کہ بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی سونے کے زیور پہنتی ہیں اور اگر نیچے عبدالکریم اور قائم دین کو پکڑ لیا جائے تو اُوپر زینے کا دروازہ کھلوایا جا سکتا ہے۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ انہیں کہیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میں درخت پر ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ کبھی کبھی ان کی باتیں بھی نہیں سنائی دیتی تھیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے

منہ سے چیخ نکل جاتی گی اور میں نیچے گر پڑوں گا۔ جب وہ چلے گئے تو میں ڈرتے ڈرتے
درخت سے اُترا اور سیدھا میاں جی کے گھر پہنچا۔ بڑی بی بی شاید میرا اعتبار نہ کرتی لیکن
چھوٹی بی بی نیچے بیٹھی ہوتی تھی۔ جب میں نے ہانپتے کانپتے انہیں ساری باتیں بتائیں تو انہوں
نے فوراً میرے پتا جی کو بلایا اور یہ کہا کہ ہم کسی سے اس کا ذکر نہ کریں اور فوراً یوسف صاحب کے
پاس جائیں"۔ یوسف نے پوچھا۔

"اور چراغ بی بی کو بھی انہوں نے بھیجا تھا؟"

ہر دیال سنگھ بولا "نہیں جی! جب میں بی بی جی سے باتیں کر رہا تھا تو اس نے زینے
سے چیخیں مارنی شروع کر دیں اور پھر روتی ہوئی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ میں نے اسے روکنے
کی کوشش کی مگر چھوٹی بی بی نے کہا۔

"نہیں نہیں اسے لے جاؤ۔ اس کا جانا بہتر ہوگا"۔

یوسف نے مڑ کر چراغ بی بی کی طرف دیکھا اور کہا "چراغ بی بی تم ابھی تک یہیں کھڑی
ہو تمہیں معلوم نہیں کہ ڈاکو جس جگہ رونے کی آواز سنتے ہیں وہاں فوراً پہنچ جاتے ہیں"۔

چراغ بی بی نے منہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے کہا "جی میں بالکل نہیں روؤں گی"۔

یوسف نے کہا "ہر دیال سنگھ! تم سب میرے ساتھ آؤ۔ مجھے گاؤں سے چند آدمی لے جانے
پڑیں گے"۔

گھر پہنچ کر یوسف نے گاؤں کے دس آدمیوں کو جمع کر کے چند ہدایات دیں اور پھر ایک
رقعہ لکھ کر بلو کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"بلو! تم فوراً تھانیدار کو میرا یہ رقعہ پہنچا دو اور شام ہونے سے پہلے واپس پہنچنے کی کوشش
کرو۔ آج رات ہم نے ایک بہت بڑا شکار پکڑنا ہے"۔ "میاں جی، شکار کے لیے میری برچھی کی ضرورت
بھی ہو گی؟"

"ہاں لیکن اندھیرا ہونے سے پہلے ہم نے میاں عبدالکریم کے گاؤں پہنچ جانا ہے"۔

"میاں جی میں سورج ڈوبتے ہی یہاں پہنچ جاؤں گا"۔

یوسف نے باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم مہمان خانے میں بیٹھو، میں چراغ بی بی
کو چھوڑ کر ابھی آتا ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی دادی، والدہ اور گھر کی دوسری خواتین کے سامنے کہہ رہا تھا۔

"چراغ بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے یہ کسی بھوت سے ڈر گئی ہے اور اس خوف
کا اثر یہ ہے کہ یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چیخیں مارتی ہے۔ ایک دوائی سے اس کی طبیعت کچھ
ٹھیک ہو گئی ہے لیکن چونکہ بھوت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہیں رہے گی۔ اگر بھوت
زیادہ خطرناک ثابت ہوا اور اس نے دوبارہ چیخنا شروع کر دیا تو اسے پچھلی کوٹھڑی میں بند کر دیں"۔

"لیکن یہ یہاں کیسے پہنچی ہے؟" دادی نے پوچھا،

"دادی جان! اسے یہاں تک لانے کے لیے گاؤں سے دو آدمی آئے تھے"۔

چراغ بی بی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی لیکن یوسف کے سامنے کوئی بات نہ کر سکی۔

نو بجے کے قریب بارش شروع ہو چکی تھی اور گنگا سنگھ بے چینی سے اپنے مہمانوں
کا انتظار کر رہا تھا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے بھاگ کر کنڈی کھولی۔ اس کے ساتھ
ہی دو آدمی جنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اندر داخل ہوئے اور ایک نے اپنے مضبوط
ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی دوسرا اُسے دھکیلتا ہوا صحن سے آگے کمرے میں لے گیا۔
تیسرے آدمی نے اُسے آن کی آن میں رسّی سے جکڑ کر فرش پر ڈال دیا۔ اس کی پگڑی کا ایک سرا
اس کے منہ میں اس طرح ٹھونس دیا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ دو منٹ میں
یوسف کے علاوہ آٹھ آدمی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ پھر کسی اور نے دروازہ کھٹکھٹایا اور تین آدمی
اور ڈھاٹے باندھے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ صحن میں جو چار آدمی ڈھاٹے باندھے ہوئے کھڑے
تھے انہیں کسی زور آزمائی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ وہ اطمینان سے انہیں باقی ساتھیوں کے پاس
لے گئے اور باندھ کر گنگا سنگھ کے پاس لٹا دیا۔ دس منٹ بعد دو اور ان کے قابو میں آ چکے تھے۔

پھر کوئی بیس منٹ گزر گئے اور انہیں ارجن سنگھ کے متعلق مایوسی ہونے لگی۔ بارش میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بشن سنگھ نے اپنے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلا "سردار جی! آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں تو بارش میں کھڑے کھڑے ٹھٹھر رہا تھا۔ آپ کو اتنے آدمی جمع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔"

"کیا بکتے ہو۔ میں نے صرف چار آدمی بھیجے ہیں"

"جناب! گنگا سنگھ نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے زیادہ آدمی جمع کر لیے ہوں گے ورنہ یہاں تین چار آدمی بھی کافی تھے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ سے مایوس ہو کر اندر بیٹھ گیا ہے۔"

"او گنگا سنگھ کے بچے"! ارجن سنگھ نے کہا "بے وقوف خاموش رہو۔ میاں عبدالکریم گاؤں میں آگیا ہے نا؟"

اندر سے دروازہ کھلا اور جگجیت سنگھ نے کہا "جی وہ آگیا ہے۔"

"میرے آدمی کہاں ہیں؟"

یوسف نے کہا۔ "آئیے، وہ اندر بیٹھے ہوتے ہیں۔"

"گنگا سنگھ کہاں ہے؟"

"جی وہ ان کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔"

"کن کے ساتھ باتیں کر رہا ہے؟"

"مہمانوں کے ساتھ۔"

"مہمان کون ہیں؟"

"جن کو اس نے مدد کے لیے بلایا ہے۔"

"وہ بڑا بدمعاش ہے۔"

"بدمعاش وہ ہوتا ہے جو رات کے وقت نہتے لوگوں کے گھر میں پستول لے کر پھرتا

ہے۔ لیکن اب تمہیں اپنا پستول پھینک دینا چاہیے۔ تیز برچھی تمہاری کمر کو چھو رہی ہے اور تمہارا ساتھی بشن سنگھ اگر دائیں بائیں دیکھ سکے تو اسے ایک نیزہ اور تلوار دکھائی دے گی۔ فضل دین اس کے ہاتھ سے پستول پکڑ لو۔"

ارجن سنگھ ایک ثانیہ تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا لیکن جب پیچھے سے بلّو نے برچھی کو ذرا دبایا تو اس نے بھرا ہوا پستول نیچے پھینک دیا۔ یوسف نے کہا "اس کی اچھی طرح تلاشی لو۔"

اب بلّو اور فضل دین دونوں اس کی اطمینان سے تلاشی لینے کے بعد ایک خنجر ایک چاقو اور اٹھائیس گولیاں برآمد کر چکے تھے۔ فضل دین ارجن سنگھ کے باقی ساتھیوں کو مضبوط رسّی کے ساتھ جکڑ چکا تھا لیکن وہ مطمئن نہ تھا وہ بھاگ کر گھر گیا اور ایک پلنگ کی نئی نواڑ کے دو بنڈل اٹھا کر لے آیا۔ اس نے سب سے پہلے ارجن سنگھ کو باندھا پھر اس کے ساتھیوں کو دوبارہ کسا۔ اس کے بعد ان سب کو تھانے پہنچانے کے لیے حویلی کے اندر ایک گڈے پہ ڈالا گیا تو باقی نواڑ استعمال کی گئی۔ حالت یہ تھی کہ ڈاکوؤں کے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوتے تھے۔ اور ارجن سنگھ کے ہاتھ بھی اس طرح باندھ دیئے گئے تھے کہ ایک سے دوسرا جدا نہ ہو سکے۔ گڈے پر ڈالتے وقت ان کے آرام کا بھی خیال کیا گیا تھا اور ان کے نیچے کچھ پرالی ڈال دی گئی تھی لیکن نواڑ کا جو حصہ بچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ گڈے کے تختے کے ساتھ اس طرح کس کر باندھ دیئے گئے تھے کہ ارجن سنگھ پیٹھ کے بل سب کے نیچے پڑا ہوا تھا اور باقی سب کا بوجھ اس کے اوپر تھا۔

بارش تیز ہو چکی تھی اور پانی میں بھیگ جانے کے باعث نئی نواڑ کا کھچاؤ بتدریج زیادہ بڑھ رہا تھا۔ ارجن سنگھ اور اس کے ساتھی ایک ناقابل برداشت اذیت کی حالت میں دہائی دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے منہ فضل دین نے اس احتیاط سے بند کیے تھے کہ کسی کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ یوسف نے جگجیت سنگھ کی حویلی کا دروازہ کھلوایا فضل دین سے کہا "تم جا کر

اپنی حویلی کا پھاٹک کھلواؤ۔ پولیس کے آنے تک یہ گڈا تمہاری حویلی میں رہے گا۔"

دس منٹ بعد عبدالکریم اور گاؤں کے دوسرے لوگ علاقے کے مشہور و معروف ڈاکو ارجن سنگھ کو ٹارچ کی روشنی میں ایک ناقابلِ یقین حالت میں دیکھ رہے تھے عبدالکریم نے سر پر چھتری تان رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس نے اچانک جگجیت سنگھ کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم بہت بڑے انعام کے حق دار ہو لیکن چراغ بی بی تمہارے ساتھ گئی تھی اُسے ڈاکو پکڑ کر تو نہیں لے گئے"۔

یوسف نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: جی آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں اُسے اپنے گھر چھوڑ آیا ہوں"۔ پھر اس نے بلو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ تم ابھی تھانیدار کی طرف جا کر انہیں میرا سلام کہو اور یہ بتاؤ کہ ہم نے ڈاکو ارجن سنگھ اور اس کے چھ ساتھی پکڑ لیے ہیں اور انہیں تھانے بھیجا جا رہا ہے"۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! یہ بہتر نہیں ہے کہ پولیس ان خطرناک آدمیوں کو خود گرفتار کر کے یہاں سے لے جائے؟"

یوسف نے جواب دیا "اب یہ خطرناک نہیں ہیں۔ اب میرے آدمی تھانے تک ان کے ساتھ جائیں گے"۔

جگجیت سنگھ! تم مضبوط بیلوں کی ایک جوڑی لے آؤ"۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! ذرا اُوپر جا کر بچوں کو تسلی دے آؤ۔ انہیں یقین نہیں آتا کہ ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔

"آیئے" یوسف نے کہا اور عبدالکریم اس کے ساتھ چل دیا۔ امینہ اس کی ماں اور بھائی بالائی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ یوسف نے آگے بڑھ کر سلام کرنے کے بعد کہا "چچی جان! میں آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے آیا ہوں کہ ڈاکو ارجن سنگھ اور اس کے

چھ ساتھی نیچے گڈے کے اندر آپ کی نئی نواڑ سے اس طرح بندھے ہوئے پڑے ہیں کہ وہ سانس بھی نہیں لے سکتے"۔

"لیکن بیٹا یہ کیسے ہوا؟ مجھے تو فضل دین کی قسموں پر بھی یقین نہیں آسکتا۔ وہ ایک ہی پلنگ کی نواڑ کافی سمجھتا تھا۔ میں نے زبردستی نواڑ کے دونوں نئے بنڈل اُسے دے دیئے تھے۔ یہ نواڑ میں نے پچھلے ہفتے ہی امرتسر سے منگوائی تھی"۔

"چچی جان! معلوم ہوتا ہے کہ یہ نواڑ بنائی ہی ڈاکوؤں کے لیے گئی تھی۔ قائم دین نے اسے اتنی احتیاط سے استعمال کیا ہے کہ وہ سانس بھی نہیں لے سکتے"۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! آپ نے ان ڈاکوؤں کو گرفتار ہی نہیں کیا بلکہ میرے گھر سے اکیس ہزار روپیہ نقد انعام حاصل کرنے سے انہیں محروم بھی کر دیا ہے۔ اب میں صبح ہوتے ہی اکیس ہزار روپیہ یہاں رکھنے کی بجائے قائم دین کے ہاتھ امرتسر واپس بھیج دوں گا یا گورداسپور کے بنک میں جمع کرادوں گا اور سیٹھ دینا ناتھ کو اطلاع بھیج دونگا کہ میں نے چند دن کے لیے زمین خریدنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے"۔

"کون سی زمین خریدنے کا ارادہ؟"

"بیٹا! سیٹھ دینا ناتھ نے اپنے گاؤں کے ایک زمیندار سورن سنگھ سے زمین کا سودا کروایا تھا اور کل میں نے رقم کی ادائیگی کے لیے گورداسپور پہنچنا تھا"۔

یوسف نے پوچھا "دینا ناتھ کو اس بات کا علم تھا کہ آپ آج رات رقم لے کر گھر پہنچ جائیں گے؟"

"ہاں میں اس کے ساتھ وعدہ کر کے آیا تھا۔ میں نے سورن سنگھ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ میں بنک سے کورے نوٹ لے کر آؤں گا"۔

امینہ نے کرسیاں گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے کہا۔

"جناب اگر ڈاکوؤں کے بھاگ جانے کا خطرہ نہیں تو آپ اطمینان سے بات کریں"۔

یوسف نے عبدالکریم کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "میاں صاحب! اگر دینا ناتھ کو یہ

معلوم تھا کہ آپ روپیہ لے کر آرہے ہیں تو آپ اُسے یہ بالکل نہ کہیں کہ آپ نے سودا ملتوی کر دیا ہے بلکہ یہ لکھیں کہ آپ کا منشی پرسوں ایک ضروری کام سے فارغ ہوتے ہی رات کی گاڑی پر رقم لے کر پہنچ جائے گا اور سردار سورن سنگھ کو خوش کرنے کے لیے نئے نوٹوں کے علاوہ ایک ہزار چمکتے ہوئے نئے سکے بھی لیتا آئے گا۔

میاں جی! میں آپ کو یہ بعد میں بتاؤں گا کہ میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ ان ڈاکوؤں کے گرفتار ہوجانے سے بھی زیادہ ضروری۔ اگر دینا ناتھ یہ پوچھے کہ آپ پیسے ساتھ لے کر کیوں نہیں آتے تو آپ اپنے منشی کا دیر سے بنک پہنچنے کا عذر یا کوئی اور بہانہ پیش کر دیں آپ اپنے منشی کو بھی یہ خط لکھ دیں کہ وہ پرسوں رات گاڑی پر سوار ہوکر یہاں آنے کے لیے تیار رہے۔ باقی ہدایات کے لیے ہمیں آپ کے نوکر فضل دین سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ ہر بات خط میں نہیں لکھی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکوؤں کی گرفتاری کا سن کر دینا ناتھ چند دن آپ کے پاس آنے سے اجتناب کرے لیکن آپ کی کامیابی اس میں ہے کہ آپ اسے اس بات پر قائل کرلیں کہ زمین خریدنے کے بارے میں آپ کے ارادے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ "بھئی اس وقت میرا خیال یہی ہے۔ اب تو میں اسے یہاں تک یقین دلاؤں گا کہ میں اس کی مدد سے چالیس پچاس ایکڑ زمین اور بھی خریدنا چاہتا ہوں۔ اگر زمین کا کوئی اچھا ٹکڑا مل گیا تو میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں بجلی بھی پہنچ جائے۔ ملاقات کے دوران اگر آپ اس کے ذہن میں یہ ڈال دیں کہ آپ کی وجہ سے پولیس کے ساتھ اس کے چھوٹے موٹے کام آسانی سے نکل جایا کریں گے تو یہ اور بھی بہتر ہوگا۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! میں سب سمجھتا ہوں۔ میں صبح دینا ناتھ کو ایسا خط لکھوں گا کہ وہ بھاگتا ہوا یہاں آئے گا۔"

"چچا جی آپ کا منشی پرسوں رات رقم لے کر شام کی گاڑی پر سٹیشن پر پہنچ جائے گا اور سورن سنگھ کے لیے نئے نوٹوں کے علاوہ ایک ہزار چمکتے ہوئے سکے بھی لائے گا۔ پھر اگلی صبح گورداسپور کچہری میں رجسٹری کے وقت یہ رقم اس کے حوالے کی جائے گی۔"

"بیٹا! میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ قائم دین نے اوپر آکر کہا۔ "ہر دیال سنگھ نے گڈے کے ساتھ بیل جوت دیئے ہیں اور فضل دین کہتا ہے شاید پولیس بھی آرہی ہے۔"

"بھئی شاید کا کیا مطلب؟"

"جی وہ یہ کہتا ہے کہ گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی ہے۔"

عبدالکریم نے کہا "گھوڑوں پر ڈاکو بھی آسکتے ہیں۔ یوسف نے اُٹھ کر بندوق سنبھالتے ہوئے کہا "نہیں جی اب یہ خطرہ نہیں ہوسکتا۔ آپ اوپر سے دروازہ بند کرلیں۔ میں نیچے دیکھتا ہوں۔"

پانچ منٹ بعد قائم دین نیچے سے آوازیں دے رہا تھا۔

"میاں جی، پولیس پہنچ گئی ہے۔"

عبدالکریم گلی میں پہنچا تو تھانیدار گھوڑے سے اُتر کر ٹارچ کی روشنی میں بندھے ہوئے ڈاکوؤں کا معائنہ کر رہا تھا

"یار! مجھے تو ان کا سر پیر نظر نہیں آرہا۔"

فضل دین نے کہا "جناب، یہ سات آدمی ہیں۔ چار جو ارجن سنگھ کے ساتھ آئے تھے دو جو اس گاؤں سے اس کے ساتھ ملے تھے اور جناب ساتواں ارجن سنگھ ہے۔"

"تھانیدار نے جھنجھلا کر کہا "کیا بکتے ہو؟ وہ ساتواں کہاں ہے؟"

"جناب، ساتواں نیچے ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے گڈے کے نیچے؟"

"نہیں جناب ساتواں ان کے نیچے ہے۔"

"کن کے نیچے؟"

"ان چھ کے نیچے جو اس کے اُوپر پڑے ہوئے ہیں۔"

"میں ٹارچ روشن کرتا ہوں۔ اگر آپ غور سے دیکھیں وہ تھوڑا بہت نظر آجائے گا۔"

"وہ زندہ ہے؟"

"جناب، جب اُسے باندھا گیا تھا تب تو بالکل زندہ تھا۔ اب یہ دیکھنے کے لیے اسے کھولنا پڑے گا۔"

"ہم ان سب کو ہتھ کڑیاں لگانا چاہتے ہیں۔ تم انہیں ایک ایک کر کے کھولنا شروع کر دو۔"

"جناب یہ ایک ایک کر کے نہیں کھلیں گے۔"

"کیا بکواس ہے۔ یہ ایک ایک کر کے کیوں نہیں کھلیں گے۔"

"جناب، یہ ایک ایک کر کے اس لیے نہیں کھلیں گے کہ مَیں نے انہیں اپنے ہاتھوں سے باندھا ہے۔" فضل دین نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

ہردیال سنگھ نے کہا۔ "سرکار یہ گدّے پر بندھے ہوتے ہیں۔ انہیں وہیں رہنے دیں۔ اور گدّے کو اسی طرح تھانے لے چلیں۔ میاں یوسف کے آدمی ساتھ جائیں گے۔"

"میاں یوسف صاحب میاں عبدالرحیم کے صاحبزادے جنھوں نے مجھے رقعہ لکھا تھا۔ وہ یہیں ہیں؟"

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تھانیدار صاحب، میں یہیں ہوں اور میرے خیال میں زیادہ مناسب یہی ہے کہ رات یہاں ہتھ کڑیاں لگا کر ان کے گرد پہرہ دینے کی بجائے انہیں تھانے بھیج دیں۔ میں دس قابلِ اعتماد آدمی اسی وقت آپ کے ساتھ روانہ کر سکتا ہوں اور اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو مَیں خود بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"میاں صاحب! بگّو کی باتیں سننے کے بعد مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ارجن سنگھ کو آپ نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے اسی وقت گورداسپور کے انسپکٹر صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں نے ایس پی صاحب کو خبر دی تھی اور فوراً مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں خود جا کر تصدیق کروں کہ ارجن سنگھ کیسے گرفتار ہوا۔ انسپکٹر صاحب کو میں نے آپ کا رقعہ ملنے کی بھی اطلاع دی تھی اور اس کے بعد

جب تک آپ کا آدمی دوبارہ میرے پاس نہیں آیا ان کے دو ٹیلیفون آ چکے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو اس کارگزاری پر ایک بڑا انعام ملے گا۔"

"مَیں نے جو کیا ہے وہ ایک فرض سمجھ کر کیا ہے اور انعام کے لیے مَیں اپنا ساتھ دینے والے کو آگے کروں گا۔"

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "جناب، مجھے تو یہ سانس لیتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دیتے۔"

یوسف نے کہا۔ "ان کے منہ سے کپڑے نکال دو۔"

فضل دین نے پوچھا۔ "جی سب کے منہ سے؟"

"ہاں سب کے منہ سے۔"

"جناب میرا مطلب ہے ارجن سنگھ کے منہ سے بھی؟"

"ہاں۔ اس کا سانس لینا زیادہ ضروری ہے۔"

"اچھا جی۔ کام تو بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کرتا ہوں۔"

یوسف نے غصّے میں آ کر کہا۔ "کوشش نہیں یہ ضروری ہے۔"

فضل دین نے کہا۔ "ہردیال سنگھ! میری مدد کرو ورنہ تم میاں جی سے جو نواز حاصل کرنا چاہتے ہو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ میں ٹارچ سے روشنی کرتا ہوں اور تم اس جگہ سے نواڑ کاٹ دو جہاں سے ہمارے ہاتھ ارجن سنگھ کے منہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔"

یوسف نے تھانیدار، اے ایس آئی، ہیڈ کانسٹیبل اور پولیس کے آٹھ سپاہیوں سے کہا۔ "چلیے میاں صاحب کی خواہش ہے کہ آپ اندر جا کر چائے پی لیں۔"

تھانیدار نے کہا۔ "بھئی فضل دین، اگر اوپر کے دو تین آدمیوں کو ہتھ کڑیاں لگا دینے کے لیے جگہ بنا لو تو ہماری تسلی ہو جائے گی اور ہم اطمینان سے میاں صاحب کی چائے پی لیں گے۔"

یوسف نے کہا" جناب میرے مسلح آدمی یہاں موجود ہیں اور اگر کوئی یہاں موجود نہ ہوتا تو بھی صرف بِلّو ہی اپنی برچھی کے ساتھ کافی تھا۔"

چائے پر بیٹھتے ہوئے یوسف نے تھانیدار سے کہا۔

"جناب! آپ ان قیدیوں کو حوالات میں بھیجنے کی بجائے تفتیش کے سلسلے میں دو چار دن کے لیے تھانے میں روک سکتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ان کا جسمانی ریمانڈ لیا جا سکتا ہے۔"

"تو انسپکٹر صاحب سے میری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ان قیدیوں کو پانچ چھ روز کے لیے تھانے میں ہی رہنے دیں۔ سردست میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا لیکن یہ بہت ضروری ہے۔"

تھانیدار نے کہا یوسف صاحب! یہ تو اتنی معمولی سی بات ہے کہ اگر میں ٹیلی فون پر بھی کہہ دوں کہ یوسف صاحب کی یہ خواہش ہے کہ انہیں روک لیا جائے تو انہیں روک لیا جائے گا۔"

وہ چائے پی کر اٹھنے کو تھے کہ فضل دین بھاگتا ہوا اندر آیا اور کہنے لگا۔

"جناب، وہ سب زندہ ہیں اور ارجن سنگھ بھی زندہ ہے لیکن بڑی گالیاں دیتا ہے"

"کس کو گالیاں دیتا ہے؟ ایک سپاہی نے پوچھا۔"

"جی باندھنے والے کو گالیاں دیتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک اسے میرا نام معلوم نہیں"۔ تھوڑی دیر بعد گڈا روانہ ہو چکا تھا۔ پولیس کے دو افسر اور نو سواروں کے علاوہ گاؤں کے آدمی اس کے ساتھ جا رہے تھے۔ یوسف نے عبدالکریم کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا" اچھا چچا مجھے اجازت دیجئے۔"

عبدالکریم نے کہا" بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ باقی رات آپ یہیں رہیں گے۔"

" دیکھئے چچا جان میرا اس لیے جانا ضروری ہے کہ امی جان پریشان ہوں گی اور چراغ بی بی

کو بھی تسلی دینا ضروری ہے۔ میں انشاء اللہ کل آپ سے ملوں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بچوں کو چند دن کے لیے ہمارے گھر بھیج دیں کیونکہ اس واقعہ کے بعد ان کا خوفزدہ ہونا ایک قدرتی بات ہے۔"

"بیٹا اگر تم یہ نہ کہتے تو بھی میں یہی کرتا۔"

"چچا جی! آپ آرام سے سو جائیں۔ اب یہاں دوبارہ ڈاکوؤں کے حملے کا کوئی خطرہ نہیں تاہم میں چند اور آدمی آپ کے گاؤں کی حفاظت کے لیے بھیج دوں گا۔"

یوسف نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عبدالکریم تذبذب کی حالت میں اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کہا۔

"بیٹا یوسف! ذرا ٹھہرنا تمہاری چچی کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

رشیدہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا" بیٹا یوسف! تمہارے چچا جس کام سے جھجک محسوس کرتے ہیں اس کے لیے مجھے آگے کر دیا کرتے ہیں۔ یہ لو بیٹا، ہم تمام عمر تمہاری نیکیوں کا صلہ نہیں دے سکتے لیکن ہماری خواہش ہے کہ یہ چھوٹا سا نذرانہ قبول کر لو۔"

رشیدہ نے ایک رومال میں بندھے ہوئے پانچ پانچ سو روپے کے دس نوٹ یوسف کو پیش کر دیے۔ یوسف نے تڑپ کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا" چچی جان، چچا جان! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔"

عبدالکریم نے کہا" بیٹا! تم نے روپے کے ساتھ ہماری عزت اور جانیں بھی بچائی ہیں۔"

یوسف نے کہا۔" چچا جی! میں نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی معاوضے کے لیے نہیں کیا۔ رشیدہ نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں آپ کو پانچ ہزار روپیہ پیش کر کے حماقت کر رہا ہوں۔ لیکن بیٹا یہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکتی تھی کہ آپ میرے گھر سے خالی جائیں گے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دو۔"

یوسف نے کہا" چچی جی! میں خالی ہاتھ لے کر نہیں جا رہا۔ میں یہ یقین لے کر جا رہا

ہوں کہ اللہ نے مجھے کسی نیکی کی توفیق دی تھی۔"

رشیدہ بولی "لیکن بیٹا! آپ یہ تو نہیں چاہیں گے کہ میں آپ کے ساتھیوں کو کوئی انعام دوں۔"

"نہیں چچا جان!"

"جب ہم آپ کے گاؤں میں آئیں گے تو میں انہیں ایک ایک کر کے بلاؤں گا اور آپ انہیں کھلے دل سے انعام دے سکیں گے۔"

"اب مجھے اجازت دیجئے۔"

یوسف مصافحہ کر کے وہاں سے چل دیا۔ بارش تھم چکی تھی اور جسم کی گرمی سے اس کے کپڑے خشک ہو چکے تھے۔ گاؤں کی مسجد کے قریب پہنچ کر اس نے بلّو سے کہا۔

"بلّو! تم جاؤ اور ہمارے گھر سے روٹی منگوا کر کھانے کے بعد آرام کرو۔ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔"

جب وہ نماز پڑھ کر باہر نکلا تو بلّو دروازے سے چند قدم دُور کھڑا تھا۔

"بلّو، تم گئے نہیں؟"

"آپ کو معلوم تھا کہ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔"

چند منٹ بعد وہ ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے نوکر سے کہہ رہا تھا، "بلّو کو کھانا کھلا دو۔"

چراغ بی بی چند عورتوں کے درمیان چھت کے ایک حصّے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گذشتہ چند گھنٹوں میں ڈاکوؤں، بھوتوں، چڑیلوں، جنوں اور سانپوں کے قصّے سُن کر کئی بار بیچارگی کی حالت میں آنسو بہا چکی تھی۔ اس سے اظہار ہمدردی کے لیے گاؤں کی وہ سیانی عورتیں بھی وہاں جمع ہو چکی تھیں جنہوں نے بذاتِ خود یا جن کے کسی جان پہچان والے نے اپنی آنکھوں سے کسی خوفناک چڑیل، کسی چھوٹے سے چھلاوے یا مہیب دیو کو دیکھا تھا۔ ایک ایسی بڑھیا کا

ذکر سن کر جس کھاٹ کے گرد سات خوفناک بھوت گدھوں کی صورت میں اپنی ٹانگوں کے ساتھ گھنگرو باندھ کر ناچا کرتے تھے، خوف سے چیخ مار کر بیہوش ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی سے سائیں جی کا ایک مُرید اپنے تکیے میں موجود تھا۔ اُس نے اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر دم کیا اور اسے ہوش آ گیا۔ پھر اسے لیموں کے عرق میں پانی اور نمک ملا کر پلایا گیا تو وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ جب یوسف واپس آیا تو وہ اس سے کئی سوال پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس سے یوسف اتنا کہہ کر دوسری طرف چلا گیا کہ "انشاء اللہ صبح کو وہ سب یہاں آ جائیں گے۔ اور ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں، ان کے متعلق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

صبح ہوتے ہی میاں عبدالکریم اور اس کے بال بچے یوسف کے گھر پہنچ گئے۔ تاج دین اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر وہ یوسف کے چچا سے مشورہ کرنے کے بعد گھر کی حفاظت کے لیے ان کا ایک نوکر ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اپنی ماں کو رخصت کرتے ہوئے چراغ بی بی نے اچانک اس کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر کے گھر کی عورتوں کو حیران کر دیا جن کا یہ خیال تھا کہ اب مُدّت تک اس کے دل پر ڈاکوؤں کا خوف طاری رہے گا۔

اس کے طرزِ عمل سے ان تمام باتوں کی نفی ہوتی تھی جو چراغ بی بی کے خوف و ہراس کے متعلق گھر کی لڑکیوں نے امینہ کو بتائی تھیں۔ امینہ کی ماں کو اس بات کا احساس ہُوا کہ وہ چڑ گئی ہے تو اس نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "نہیں چراغ بی بی ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔ امینہ کا تمہارے بغیر جی نہیں لگے گا۔ کل پرسوں سب واپس چلے جائیں گے۔" چراغ بی بی کی ماں عالم بی بی نے کہا۔

"دیکھو لڑکی! جب شام ہو گی تو تم پھر چیخیں مارتی ہوئی واپس آؤ گی۔ آرام سے یہاں ہی رہو۔" چراغ بی بی کو اس کے تیور دیکھ کر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

یوسف باہر مہمان خانے میں عبدالکریم اور اس کے نوکر فضل دین سے تفصیلی باتیں کر رہا تھا۔ عبدالکریم اپنی کارگزاری کی پوری تفصیلات سنانا چاہتا تھا، لیکن یوسف نے یہ

کہہ کر بات مختصر کر دی۔

"پہلے مجھے یہ بتائیے کہ انہوں نے آپ کو خط کا جواب کیا لکھا ہے۔ اگر وہ خط آپ کے پاس ہے تو میں پڑھ لیتا ہوں"۔

عبدالکریم نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر اُسے پیش کر دیا۔

سیٹھ دینا ناتھ نے لکھا تھا "دوست مہربان جناب میاں عبدالکریم صاحب، شکر ہے کہ بھگوان کی کرپا نے آپ کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔ اس خوشی کے موقع پر آپ کو کچھ دان کرنا چاہیے۔ میں آپ کے حکم کے مطابق سردار سورن سنگھ کو لے کر پرسوں ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ امید ہے کہ ہم دوپہر تک رجسٹری کا کام ختم کر کے بس پر واپس آجائیں گے۔

زیادہ آداب

عبدالکریم نے اپنی جیب سے دوسرا خط نکالتے ہوئے کہا۔

برخوردار یہ بھی پڑھ لو۔ یہ اس خط کی نقل ہے جو میں نے اسے بھیجا تھا"۔

یوسف نے خط کھول کر اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب! یہ آپ نے بہت ٹھیک کیا"۔

اس نے خط لپیٹ کر میاں صاحب کو واپس دیتے ہوئے فضل دین سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے منشی صاحب کے نام میاں صاحب کا خط لے لیا ہے"۔

"جی ہاں، انہوں نے زبانی مجھے ساری باتیں سمجھا دی ہیں"۔

عبدالکریم نے کہا "برخوردار میں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ لوہے کا ایک بھاری بکس لے کر آئے جس کو مضبوط تالا لگا ہوا ہو"۔

یوسف نے کہا۔ فضل دین، یہ تمہارا دوسرا کارنامہ ہوگا۔ تمہاری مدد کے لیے ہمارے آدمی ہر جگہ موجود ہوں گے۔ تم نے آرام سے اُترنا ہے۔ کچھ دیر کسی بہانے سٹیشن پر رُک جانا ہے اور نہیں تو پاس حلوائی کی دکان سے منشی کو گرم پکوڑے یا دودھ منگوا دینا

اور اُسے ویٹنگ روم میں بٹھا دینا۔ میاں صاحب کی ہدایت کے مطابق وہ امرتسر سے سیکنڈ کلاس میں آئے گا"۔

فضل دین نے کہا "جی میں سمجھ گیا ہوں"۔

"میاں جی یہ لڑکا بڑا ہوشیار ہے۔ ہماری تھوڑی سی نواڑ تو ضائع ہوئی ہے، لیکن اس نے بہت سوچ کر یہ سب کچھ کیا ہے"۔

اچھا فضل دین تم جاؤ اور رات واپسی پر یہاں سے ہو کر جانا۔

یوسف عصر کی نماز کے بعد باہر کی حویلی میں اپنے چچا حیدر علی اور میاں عبدالکریم کے ساتھ ایک نئے اور کشادہ مکان کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وسیع صحن میں آم اور لیموں کے پودے تھے اور ایک کونے میں بیری کا ایک تن آور درخت تھا۔ بکو بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے کہا "میاں جی، پولیس کا کوئی بڑا افسر آرہا ہے اور اس کے پیچھے حوالدار بھی ہے بڑے صاحب نے آتے ہی یہ پوچھا ہے کہ یوسف صاحب کہاں ہیں"۔

"اور تم اس کا گھوڑا پکڑ کے اور اسے اس طرف لانے کی بجائے وہاں سے بھاگ آئے ہو"۔

"نہیں جی، گھوڑے تو چوکیدار اور بوٹا عیسائی نے پکڑ لیے ہیں۔ حوالدار نے مجھے کہا تھا کہ فوراً بھاگ کر یوسف کو اطلاع کرو۔ حوالدار نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا"۔

یوسف اٹھ کر پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن اتنی دیر میں ایک بارعب آدمی جو پولیس انسپکٹر کی وردی پہنے ہوئے تھا، اندر داخل ہوا۔ یوسف نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "جناب آپ غالباً انسپکٹر عبدالعزیز ہیں"!

آنے والے نے چند بار سر سے پاؤں تک یوسف کی طرف دیکھا اور گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "میرے متعلق آپ کا اندازہ درست ہے لیکن اگر آپ کے نوکر مجھے یہ نہ بتاتے کہ آپ حویلی کے اندر موجود ہیں تو شاید میں آپ سے یہی پوچھتا کہ وہ بہادر

نوجوان کہاں ہے جس نے ایک انتہائی خطرناک ڈاکو کو گرفتار کیا ہے"۔

یوسف نے کہا" جناب یہ میرے چچا حیدر علی ہیں۔ یہ میاں عبدالکریم ہیں جن کے گھر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن آپ کے ساتھ شاید عملے کے کچھ لوگ اور بھی آتے ہیں"۔

"بھائی میرے ساتھ آنے والے کی فکر نہ کریں۔ میں نے اُسے باہر چارپائی پر بٹھا دیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ وہ چوکیدار سے خاطر کروانا جانتا ہے۔ میرا مقصد صرف آپ کو مبارک باد دینا اور آپ سے چند باتیں کرنا ہے۔ آپ تشریف رکھیں"۔

"بلو! بھاگ کر ہمارے نوکر سے کہو کہ لیموں کے شربت کا ایک جگ لے آئے اور پھر اس کے بعد چائے کا انتظام کر دے"۔

انسپکٹر نے کہا" بھئی ایک چیز کافی نہیں؟"

یوسف نے جواب دیا" نہیں جناب، شربت سے آپ کی پیاس بجھائی جائے گی اور اس کے بعد چائے سے آپ کی تھکاوٹ دُور ہو جائے گی"۔

عبدالعزیز نے کہا" ان دونوں چیزوں سے پہلے مجھے گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پلا دو"۔

یوسف نے اُٹھ کر قریب ہی پڑی ہوئی ایک مٹی کی صراحی اٹھائی اور یکے بعد دیگرے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس مہمان کو پیش کر دیے۔ جب تیسرا گلاس بھر کر پیش کرنے لگا تو عبدالعزیز نے کہا۔

نہیں بھئی ابھی نہیں یہ بعد میں پی لوں گا۔ آپ کا پانی ٹھنڈا بھی ہے اور میٹھا بھی، مَیں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی کارگزاری کی خبر آئی جی تک پہنچ چکی ہے اور ایس پی صاحب آپ پر بہت خوش ہیں۔ آپ کے لیے پولیس میں اور ترقی کا راستہ کھل گیا ہے"۔

یوسف نے جواب دیا" جناب، یہ جو کچھ ہُوا ہے اس میں میرا کوئی ذاتی مقصد

شامل نہیں تھا بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ذاتی مقصد لے کر اس کام میں ہاتھ ڈالتا تو شاید معاملہ اتنی خوش اسلوبی سے انجام نہ پاتا"۔

بہر حال یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے کسی صورت میں حکومت نظر انداز نہیں کرے گی۔ آپ کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنے کے لیے سہولت فراہم کرنا پولیس کی ذمہ داری ہے۔ آپ اپنے ساتھیوں میں سے جن قابلِ اعتماد آدمیوں کی سفارش کریں گے انہیں بھی بندوق یا پستول کے لائسنس دیے جائیں گے۔ مَیں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی خواہش کے مطابق ہم نے تمام ملزموں کا ایک ہفتے کے لیے ریمانڈ لے لیا ہے اور اگر آپ نے ضرورت محسوس کی تو انہیں ہم مزید عرصے کے لیے بھی یہاں روک لیں گے"۔

یوسف نے کہا" جناب، جس مقصد کے لیے مَیں انہیں روکنا چاہتا تھا وہ انشاءاللہ بہت جلد پورا ہو جائے گا"۔

"آپ کو کسی مہم میں پولیس کے تعاون کی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں، جن مقامی افسروں پر آپ پوری طرح اعتماد کر سکتے ہیں ان میں سے دو تین کو حکم دیں کہ وہ کل صبح نماز سے پہلے یہاں آئیں اور مجھ سے ملیں۔ میں خود تھانے اس لیے نہیں جانا چاہتا کہ میری بھاگ دوڑ سے ڈاکوؤں کے ساتھی چوکنے ہو جائیں گے"۔ عبدالعزیز نے کہا" مَیں سمجھ گیا۔ اب آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ آپ کو ارجن سنگھ کی آمد کا پتہ کیسے چلا تھا"۔

یوسف نے کہا" جناب آپ کو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن دو دن بعد آپ ساری باتیں سنیں گے تو زیادہ لطف اندوز ہوں گے"۔

چائے کے دوران عبدالعزیز بار بار غور سے یوسف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چائے ختم کرنے کے بعد اس نے کہا" بیٹا یوسف، تمہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں تمہاری والدہ اور بزرگوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اگر میری یہاں سے تبدیلی نہ ہوئی تو تم سے ملنے کے کئی مواقع

ملیں گے۔"

یوسف نے اس قوی الجثہ اور حلیم الطبع آدمی کو پہلی بار غور سے دیکھا اور کہا "سر، اس دنیا کا یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جن لوگوں کو دیکھ کر ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اچانک اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایس پی صاحب کے دل میں میری کوئی قدر و منزلت ہوئی اور مجھے کوئی انعام مانگنے کا موقع ملا تو میری پہلی اور آخری درخواست یہ ہوگی کہ انسپکٹر صاحب کو اس وقت تک یہاں رہنے دیا جائے جب تک کہ میں انہیں اچھی طرح نہیں دیکھ لیتا۔"

عبدالعزیز نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا "بیٹا، بات یہ ہے کہ ایس پی صاحب کی قدردانی کی وجہ سے ہی تو تبدیل کیا جا رہا ہوں، وہ خود تبدیل ہو رہے ہیں اور جس جگہ وہ جاتے ہیں مجھے ہمیشہ کچھ عرصہ پہلے وہاں بھیج دیتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد گاؤں کے آدمی حویلی سے باہر انسپکٹر عبدالعزیز اور حوالدار پریتم سنگھ کو گھوڑوں پر سوار ہوتا دیکھ رہے تھے۔

باب - ۱۲

اگلی صبح یوسف گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گاؤں سے ایک میل دور سردار بیلا سنگھ کے گاؤں پہنچا۔ لوگ بیلا سنگھ کی حویلی کو گاؤں سے باہر ایک کشادہ جھیل کے کنارے جایا کرتے تھے۔ اب اس گاؤں سے شہر کی طرف کھیتوں میں سے ایک مستقل راستہ بن گیا تھا۔

کھیتوں کے کنارے چلنے کی وجہ سے یہ راستہ ذرا لمبا ہو گیا تھا۔ لیکن اب لوگ اپنی عورتوں کے لیے یہی راستہ پسند کرتے تھے جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کبھی کبھی جھیل کا پانی گاؤں سے گزرنے والے راستے تک پہنچ جاتا تھا۔ سردار بیلا سنگھ نے لوگوں کی سہولت کے لیے کنارے کی مینڈھ کا کچھ حصہ اونچا کر دیا تھا، لیکن اس کے کتے دور سے آنے والے مسافروں کی بو پا کر ہی بھونکنا شروع کر دیتے تھے اور کئی نسلوں کے کتوں کی مختلف آوازیں ایک ایسا سماں پیدا کرتی تھیں کہ لوگ گاؤں سے دور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے پڑوس کے دیہات کو اس بات کا بہت کم علم ہوتا تھا کہ بیلا سنگھ کے گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔

یوسف نے جھیل کے دوسرے کنارے چکر لگانے کے بعد سردار بیلا سنگھ کی حویلی کے پھاٹک کے سامنے گھوڑا روکا اور کتے پورے زور شور سے بھونکنے لگے۔

یوسف گھوڑے سے اترا اور اطمینان سے حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

کشادہ صحن سے ایک نوجوان اور صحت مند لڑکی بھاگ کر آگے بڑھی اور اُس نے بلا جھجک اُس کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہُوئے کہا۔" ویر جی ! آپ کیسے راستہ بھول گئے۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے یوسف کی طرف دیکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ویر جی اگر آپ میرا نام بھُول گئے ہیں تو بتادوں؟"

"جیتو چڑیل میں تمہارا نام کیسے بھُول سکتا ہوں۔ اپنے پتا جی کو بلاؤ۔"

"وہ اندر ہیں۔ آپ سیدھے اندر چلے جائیں۔ وہ ابھی شکار کھیل کر آئے ہیں اور آپ میرا نام تو سیدھی طرح لیا کریں۔"

یوسف نے گھوڑے کی رسّی کھولتے ہُوئے کہا۔"ہاں بہن اجیت کور مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ مَیں گھوڑا باندھتا ہوں تم جاکر اپنے پتا جی کو بتادو کہ مَیں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ویر جی میں اتنی بڑی تو نہیں ہوگئی کہ آپ مجھے جیتو نہ کہہ سکیں۔ کُتّے پتا جی کو خبر دے چکے ہیں کہ کوئی آیا ہے۔ میں گھوڑا باندھ دیتی ہوں آپ سیدھے اندر چلے جائیں وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ وُہ خود بھی آپ کے گھر جانا چاہتے تھے اور ماں جی تو بہت ہی خوش ہوں گی۔"

یوسف نے جلدی سے گھوڑے کا رسا کھونٹے سے باندھ دیا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہُوا حویلی کے اندرونی حصّے میں داخل ہوا۔

سردار بیلا سنگھ بیری کے درخت کی چھاؤں میں ایک بھاری پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا اور اُس کا نوکر بُڈھا سنگھ اُس کے پاؤں دبا رہا تھا۔

وہ یوسف کو دیکھتے ہی اُٹھا اور ننگے پاؤں بھاگ کر اُس سے لپٹ کر بلند آواز میں بولا۔" اجیت کی ماں۔ دیکھو کون آیا ہے"۔ اجیت کی ماں صحن کے کونے میں دری پر تین عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور ایک اُس کے

کھُلے بالوں کو کنگھی کر رہی تھی۔ اس کی بیٹی بھاگتی ہوئی اُس کے قریب پہنچی اور بولی" ماں جی ! اُٹھ کر دیکھو تو سہی آپ کل سے اپنے شیر بھتیجے کو یاد کر رہی تھیں۔

ہرنام کور نے جلدی سے اپنے بال درست کیے اور سر پہ چادر لے کر آگے بڑھی اور اپنے دونوں ہاتھ یوسف کے سر پر رکھتے ہوئے بولی۔"آج چاند کہاں سے نکل آیا ہے۔ میرے سوہنے، میرے گھبرو، میرے شیر بھتیجے مَیں کل سے تمہارے گھر جاکر تمہاری ماں جی کو سلام کرنے کا سوچ رہی تھی۔ او جیتو! اپنے ویر کے لئے دودھ لاؤ"۔

اجیت کور نے قریب آکر کہا۔"ماں جی! بھائی یوسف اس وقت دودھ نہیں پیا کرتا"

بیلا سنگھ نے کہا"بے وقوف دودھ ہر وقت پیا جاسکتا ہے اور دودھ سے بہتر کیا ہے ہمارے گھر میں تمہارے بھائی کے لئے"۔

"پتا جی ! یہ صبح ناشتے کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ دوپہر کے وقت لسّی، سادہ پانی یا لیموں کا شربت پیتے ہیں۔ شام کو چائے پیتے ہیں اور رات کو سوتے وقت دودھ پیتے ہیں"۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ یہ دودھ کس وقت پیتے ہیں اور کس وقت نہیں پیتے؟"

"پتا جی اگر ویر جی ہمارے گھر نہیں آتے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انہوں نے بہنوں کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ میں دوڑا کرتی تھی تو سیدھی ان کے گھر جاتی تھی۔ ان کی ماں، چچیاں، بہنیں اور دادی سب مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اس لیے مجھے بھائی کی سب عادتیں معلوم ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں ان سے بہت ڈرتی تھیں لیکن میں ان سے نہیں ڈرتی تھی۔ پتا جی! مَیں آج بھی ان سے نہیں ڈرتی۔ اگرچہ یہ مدّت کے بعد ہمارے گھر آئے ہیں"۔

"بھئی آج ان سے ڈرنے کی خاص بات کیا تھی"۔

"پتا جی! آپ ہی تو کہتے تھے کہ میرے شیر بھتیجے نے ڈاکو ارجن سنگھ کو گرفتار کیا ہے"۔

اب اِس علاقے پر اس کا رعب چھا جائے گا۔"

"پھر تم ان سے ڈرتی کیوں نہیں۔"

"پتاجی میں اِن کی چڑیل بہن ہوں اِس لیے۔"

"اچھا تم جاؤ ہمیں باتیں کرنے دو۔" بیلا سنگھ نے یوسف کو بازو سے پکڑ کر کھاٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا — "یار یوسف، آنا تو مجھے چاہیے تھا اور میں یہ خبریں سُن کر بے چین بھی ہوا تھا لیکن مَیں نے سوچا کہ جب تک تم میں سے کوئی نہ بلائے مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ اگر مجھے کسی لڑائی کی اطلاع ہوتی تو مَیں اپنی برچھی چمکاتا اور بھاگتا ہُوا وہاں پہنچ جاتا۔"

"نہیں چچا، یہ ایک ایسا کام تھا جس کے لیے لڑائی کی ضرورت نہیں تھی اور اب بھی جس کام کے لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں اس کے لیے کسی لڑائی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"او یار کام بتاؤ۔ مَیں یہ سوچ لوں گا کہ لڑائی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔"

"چچا! بات یہ ہے کہ اب ایک بڑا شکار پکڑا جانے والا ہے۔"

"یار، اس کا نام بتا دو۔ ساری بات میری سمجھ میں آجائے گی۔ یہ ڈاکوؤں کی پارٹی کا کوئی اور آدمی تو نہیں؟"

"چچا، ڈاکو بھی پکڑے جائیں گے مگر بڑے شکار کو آپ بھی بڑا شکار ہی کہیں گے۔ آج آپ شکار سے کچھ تھک کر تو نہیں آئے؟"

"نہیں یار، شکار کہاں ہوتا ہے آج کل۔ لیکن یہ کُتے چند دن گوشت نہ کھائیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ میں صبح ان کتوں کو لے کر نکلا تھا اور انھوں نے جو گیدڑ، خرگوش، بلّے مارے ہیں وہ انہی کے کام آئیں گے۔ آج کل اگر کبھی مچھلیوں کا شوق ہو تو مجھے پیغام بھیج دیا کرو۔ اب بڑے شکار کے متعلق بتاؤ۔"

یوسف نے کہا۔ "چچا، ڈاکوؤں کو یہ معلوم ہے کہ کل شام کی گاڑی پر امرتسر کی طرف سے ایک مالدار آدمی کا منشی ایک بڑی رقم لے کر آئے گا اور وہ راستے میں اُسے لُوٹنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے پولیس کی مدد سے ان ڈاکوؤں کو پکڑنا ہے۔"

بیلا سنگھ نے کہا۔ "یار میرے ساتھ سیدھی بات کیا کرو۔ یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ ایسا مالدار آدمی عبدالکریم ہی ہوگا لیکن مجھے صاف بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"چاچا عبدالکریم کا نوکر اور ہمارے چند آدمی اُس کے منشی کو اسٹیشن لینے جائیں گے چونکہ اب کچھ دنوں کے لیے وہ اور اُس کے بال بچے ہمارے گھر ہی رہیں گے۔ ڈاکو راستے پر کسی جگہ واردات کریں گے۔ یہ جگہ اسٹیشن سے پرانی نہر تک ہو سکتی ہے۔ راستے میں سردار مہنگا سنگھ کی حویلی بھی آتی ہے۔ آپ کے پاس ایسے کتّے ہیں جن کو مہنگا سنگھ کی حویلی کے اندر بٹھا دیا جائے اور ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جائے۔ میرا مطلب ہے۔ وہ بلا وجہ بھونکنا شروع کر دیں۔"

بیلا سنگھ بولا، "او بھتیجے میں تمھارا مطلب سمجھ گیا ہوں، میرے پاس آٹھ کُتّے ایسے ہیں جو خاموشی سے میرے آدمیوں کے ساتھ رہیں گے اور وُہ صرف اسی وقت حملہ کریں گے جب انھیں شِشکارا جائے گا تمھیں جس جس جگہ حملے کا خطرہ ہوگا وہاں آس پاس ہم دو دو کُتّے چھپا دیں گے۔ تم نے میری کتّوں والی حویلی نہیں دیکھی۔ چلو وہاں بارہ کتّے ایسے ہیں جنھیں ہم نہر سے کچھ دُور بٹھا دیں گے۔ جب دوسرے کتّے بھونکیں گے تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا۔ پھر تم ایک عجیب تماشا دیکھو گے۔ چلو پہلے میرے کُتّے دیکھ لو۔"

"چچا میں نے آپ کے کتّے دیکھے ہوئے ہیں۔ تمھارے آدمیوں کے پاس چند ٹارچیں ضرور ہونی چاہئیں تاکہ میرے آدمیوں سے کتّے چھوڑنے میں غلطی نہ ہو جائے۔"

"چچا یہ بندوبست میں پہلے کر چکا ہوں۔ جب گاڑی سے عبدالکریم کا منشی اُترے

گا تو میرے آدمیوں کے علاوہ پولیس کے آدمی بھی ساتھ چل پڑیں گے اور ان میں سے چند آدمیوں کے ہاتھ میں ٹارچیں ہوں گی۔ ڈاکو کسی مکئی یا کماد کے کھیت سے نکل کر حملہ کریں گے اور ان کی طرف ٹارچ کی روشنیاں کر دی جائیں گی۔ ہمارے باقی ساتھی مہنگا سنگھ کی حویلی میں ہوں گے۔ حوالدار صبح میرے پاس آیا تھا اور میں نے تمام پلان سمجھا دیا تھا۔ آپ ایک اور خبر سن کر خوش ہوں گے کہ وہ بہادر سنگھ جو آپ کا شکار دیکھنے آیا کرتا تھا۔ یہاں پہنچ جائے گا۔"

"یار وہ لڑکا جو پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ اس کی ترقی ہوئی کہ نہیں۔"

یوسف نے کہا "وہ ڈیرہ بابا نانک کے تھانے میں ہے وہاں سے وہ چار آدمی اپنے ساتھ لیکر آئیگا۔ میں نے اپنے تھانے دار سے اسے بلانے کے لیے کہا تھا اور اُس نے انسپکٹر سے کہہ کر اُسے یہاں بلا لیا ہے۔"

"اچھا اب تم اِس بڑے شکار کے متعلق بتاؤ گے یا نہیں بتاؤ گے وہ بھی پکڑا جائے گا یا نہیں۔"

بڑے شکار کو آپ دو تین روز میں دیکھ لیں گے اور حیران رہ جائیں گے۔"

"یار نام نہیں بتاؤ گے اُس کا؟"

"چاچا ابھی یہ آپ کسی پر ظاہر نہ کریں۔ ابھی میں آپ کو نہ بتاؤں تو بہتر ہوگا میں صِرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"اچھا جی، اگر بہت زیادہ خوشی کی بات ہے تو میں دو تین دِن صبر کر لیتا ہوں ورنہ تکلیف تو بڑی ہو گی اس بات سے کہ جو چیز مجھے پہلے معلوم ہو سکتی تھی وہ دو دِن بعد میں معلوم ہو گی۔ لیموں تو ہمارے باغ میں ملیں گے نہیں۔ ٹھنڈا پانی پی لو اور شہر سے تمہیں سوڈا واٹر کی تین چار بوتلیں پلا دوں گا۔ جیتو پانی لاؤ ٹھنڈا جلدی کرو۔"

اجیت ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا گلاس لائی اور یوسف نے پینے کے بعد کہا۔

"چچا میں شہر نہیں جا رہا اور کل تک مجھے جانا بھی نہیں چاہیے۔"

"اچھا میں سمجھ گیا ہوں کہ تم لوگوں کی نگاہوں سے دُور رہنا چاہتے ہو، لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اسٹیشن تک راستے پر ایک نظر ڈال آؤں۔"

"چچا وہاں تک تو میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں۔ شاید آپ کوئی کام کی بات سمجھا سکیں۔"

"بیٹا چلو میں تمہیں بہت سی کام کی باتیں سمجھاؤں گا۔"

"جیتو نوکر سے کہو میرے گھوڑے پر زین ڈال دے۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اور بیلا سنگھ گھوڑوں پر سوار ہو کر حویلی سے باہر نکل رہے تھے۔

بیلا سنگھ نے اپنے گھوڑے کو آگے کرتے ہوئے کہا۔ "یوسف میرے پیچھے رہو۔ ہم گاؤں کے اُوپر سے چکر لگانے کے بعد پرانی نہر سے راستہ پکڑیں گے۔"

کوئی اڑھائی گھنٹے وہ اسٹیشن سے کوئی ایک فرلانگ تک اور پھر وہاں سے واپسی پر تمام ممکن راستوں کا معائنہ کرنے کے بعد واپس آئے تو ان کے گھوڑے پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔

یوسف نے بیلا سنگھ کے گھر سے ٹھنڈے پانی کے دو اور گلاس پینے کے بعد کہا "چچا شام ہوتے ہی آپ میرے گاؤں آ جائیں۔ اگر پیدل آئیں تو بہتر ہو گا۔ ہماری باہر کی بیٹھک میں پہنچ جائیں وہاں حویلی کے اندر ہمارے گاؤں اور پولیس کے آدمی موجود ہوں گے۔"

"بہت اچھا بھتیجے، مَیں وہاں آ جاؤں گا۔"

یوسف گھوڑے پر سوار ہونے لگا۔ تو بیلا سنگھ بولا:

"دیکھو بھتیجے اب بھی یہ نہیں بتاؤ گے کہ یہ بڑا شکار کون ہے؟"

یوسف مسکرایا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے بیلا سنگھ کے کان میں کہا " جی میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

بیلا سنگھ چند قدم اس کے پیچھے آوازیں دیتا ہوا بھاگا: " او یوسف، ٹھہرو! مَیں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

لیکن یوسف نے مڑ کر نہ دیکھا۔

یوسف گاؤں پہنچا اور مسجد اور باہر کی حویلی کے درمیان ملکن کے ایک درخت کی چھاؤں میں بہادر سنگھ ایک کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

یوسف اس کے قریب پہنچتے ہی گھوڑے سے کُود پڑا اور گاؤں کے چوکیدار پیراں دِتہ نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

بہادر سنگھ بھاگتا ہُوا آگے بڑھا اور یوسف سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا: " یار ہمیں تمہارے کارنامے کی خبر مل گئی تھی۔ ہمارے تھانے کے سب لوگ حیران تھے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ یوسف صاحب سے ہر بات ممکن ہے پھر جب انسپکٹر کی طرف سے ہمارے تھانے میں یہ فون آیا کہ کسی مہم میں بہادر سنگھ کی ضرورت ہے تو میں نے تھانے دار سے کہا کہ یقیناً میری سفارش یوسف نے کی ہوگی۔"

یوسف مسکرایا " یار میں نے ہی یہ درخواست کی تھی کہ مجھے ایک نئی مہم میں بہادر سنگھ کی ضرورت ہے۔"

بہادر سنگھ نے کہا " بھگوان تمہیں زیادہ عزت دے اور تمہیں بہت بڑا افسر بنائے مَیں یہاں تھانے میں حاضری دے کر اپنے گاؤں جانے کی بجائے سیدھا یہاں بھاگتا ہوا آیا تھا میں نے آپ کو ایک اور سوار کے ساتھ دیکھا تھا اور دور سے تمہارا گھوڑا پہچان لیا تھا لیکن تم اپنے گھر آنے کی بجائے دور سے ہی واپس چلے گئے تھے۔"

یوسف نے پیراں دِتہ سے مخاطب ہو کر کہا " پیراں دِتہ بہادر سنگھ کو بیٹھک میں لے جاؤ۔ میں ان کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

بہادر سنگھ نے کہا " یوسف جی! کھانا تو میں ڈیرہ بابا نانک سے کھا کر نکلا تھا۔ بٹالہ پہنچ کر بھی کچھ پیٹ پُوجا کی تھی پھر یہاں تھانے میں حاضری دی تو حوالدار پریم سنگھ نے زبردستی لسی کے دو گلاس پلائے تھے اور مٹھائی بھی کھلا دی تھی یہاں پہنچ کر بھی میں نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیا ہے۔"

یوسف نے پیراں دِتہ سے کہا " پیراں دِتہ تم ان کے لیے ہمارے گھر سے لیموں کے شربت کا ایک جگ لے آؤ۔"

" اچھا جی میں آپ کا گھوڑا باندھ کر لے آتا ہُوں۔"

یوسف نے بہادر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا " یار آؤ تم بھی بیٹھک میں کچھ دیر آرام کر لو۔ میں کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گا اور پھر تمہیں ایسی باتیں سُناؤں گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

" یوسف جی! مَیں تو آپ کو دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا ہوں۔"

یوسف نے کہا " تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھ دوسرا سوار کون تھا؟"

" نہ جی جب آپ نظر آ رہے تھے تو میں دوسرے کو کیوں دیکھتا۔"

" یار وہ سردار بیلا سنگھ تھا اور آج یہیں پر اُس سے تمہاری ملاقات ہو گی۔"

" یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

" بہادر سنگھ یہاں اور لوگوں سے بھی تمہاری ملاقات ہو گی۔ اس لیے تم پانی پینے کے بعد سو جاؤ، جب وہ لوگ آ جائیں گے تو تمہیں جگا دیا جائے گا۔"

یوسف بہادر سنگھ کو بیٹھک میں چھوڑ کر باہر نکلا تو اُسے سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ کشادہ راستے کے سامنے رُک گیا۔

چند ثانیے کے بعد سردار بیلا سنگھ نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو یوسف جو بات تم چلتے چلتے کہہ آئے تھے اس کے بعد مجھے نیند کیسے آسکتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تم نے جان بوجھ کر گھوڑا نہیں روکا تھا۔"

یوسف نے کہا "چچا چلو بیٹھک میں تھوڑی دیر آرام کرو آپ کے لیے لیموں کا شربت آرہا ہے۔"

"دیکھو بھتیجے اگر مجھے بڑے شکار کے متعلق سب کچھ نہیں بتاؤ گے تو میں لیموں کا شربت نہیں پیئوں گا۔"

"چچا اس وقت تو میں آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ کل رات اگر میاں عبدالکریم کے منشی کو راستے میں لوٹنے والے قابو میں آگئے تو اس علاقے کے بہت سے ڈاکوؤں کے ساتھ دینا ناتھ کا تعلق ثابت ہو جائے گا۔"

بیلا سنگھ نے کہا "یار یہ تو مجھے کئی سال سے معلوم ہے۔"

"لیکن چچا ابھی تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا لیکن پرسوں آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ اگر ڈاکو کے چہرے سے نقاب اتار دیا جائے تو اُس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ آیئے بیٹھک کے اندر آپ کا ایک اور بھتیجا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

وہ حویلی میں داخل ہوئے تو بہادر سنگھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بیلا سنگھ نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

پیراں دتہ لیموں کے شربت کا جگ اُٹھائے اندر داخل ہوا اور اس نے تپائی پر جگ رکھ کر بیٹھک کی الماری سے شیشے کے گلاس نکالے اور جگ کے ساتھ تپائی پر رکھ دیے۔

یوسف نے گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ "پیراں دتہ تم بھاگ کر ایک اور جگ لے آؤ۔" بیلا سنگھ نے کہا "یار یہ کافی ہوگا۔ دو گھنٹے بعد اگر ہمیں پیاس محسوس ہوئی تو ہم

اور منگوا لیں گے۔"

بہادر سنگھ نے کہا "بھائی صاحب آپ جا کر آرام کریں میں چچا جی سے باتیں کروں گا۔"

بیلا سنگھ نے کہا۔ "ہاں بھائی تم تھک گئے ہو گے۔ جاؤ آرام کرو۔"

یوسف نے کہا "چچا آپ بھی تھوڑی دیر سو جائیں، اس کے بعد ہم یہاں چائے پئیں گے۔"

بہادر سنگھ نے کہا "ہاں چاچا بھائی یوسف کے گھر کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔"

بیلا سنگھ نے اُٹھ کر ایک کھاٹ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"یار یوسف کے گھر کی ہر چیز اچھی ہوتی ہے۔ ایسی چھاؤں بھی تو نہیں ہے ہمارے گاؤں میں۔

بہادر سنگھ تم بھی تھک گئے ہو گے۔ کرسی آگے کر لو اور مجھے یہ بتاؤ کہ اب تمہارے حوالدار بن جانے میں کتنی دیر ہے؟"

یوسف نے باہر نکلتے ہوئے کہا "کوئی دیر نہیں، چچا جی۔"

بہادر سنگھ نے کہا:

"سردار جی یوسف جو بات کہا کرتے ہیں وہ ہو جایا کرتی ہے۔ کسی دن جب وہ یہ کہیں گے کہ میں تھانیدار بن جاؤں گا تو مجھے یقین ہو جائے گا۔"

بیلا سنگھ نے کہا "ارے یوسف تمہارا دوست ہے، تو تم بڑے خوش قسمت ہو۔"

"ہاں سردار جی، جب تک میں یوسف کا دوست نہیں بنا تھا۔ مجھے کافی بیوقوف سمجھا جاتا تھا۔"

"یار میں تو تمہیں بیوقوف نہیں سمجھتا تھا۔ جیتو کی ماں تمہیں بہت یاد کیا کرتی تھی۔ آج میں نے اُسے بتایا کہ تم یوسف کے پاس آ رہے ہو تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اب تو تم نے ہماری طرف آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

"سردار جی میں اور میرے پتاجی بھی آپ کو بہت یاد کیا کرتے ہیں کسی دن شکار پر نکلیں تو ہمارے گاؤں کی طرف آجائیں نا۔"

"اچھا بیٹا اپنے پتاجی کو میرا پرنام کہنا۔"

بیلا سنگھ نے باتیں کرتے کرتے آنکھیں بند کرلیں اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

اگلے روز شام کی گاڑی آنے سے دو گھنٹے پہلے بارش شروع ہو چکی تھی اور تیز ہوا کے جھونکوں کے باعث مسافر خانے کے چھپر کا زیادہ حصہ بارش کے چھینٹوں کی زد میں آچکا تھا اور مسافر درمیانی حصے میں سمٹ رہے تھے۔ گاڑی کوئی چالیس منٹ لیٹ تھی۔ آسمان پر بادل اس قدر گہرے تھے کہ پانچ بجے سے پہلے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شام ہو چکی ہے۔

ٹھیک پانچ بجے گاڑی پہنچی — سوار ہونے والوں کی طرح اترنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ فضل دین، منشی شمس الدین کو آوازیں دیتا ہوا گاڑی کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا کہ سیکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ سے منشی شمس الدین نے گرج کر کہا۔

"بیوقوف مجھے آوازیں کیوں دے رہے ہو۔ سامان اُتارو۔"

فضل دین نے لوہے کا بکس اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا اور چلایا۔

"منشی جی! آپ خدا کے لیے نیچے اُتریں۔ گاڑی جانے والی ہے۔"

شمس الدین نے کہا۔ "بھئی! تمہارا مطلب ہے کہ میں ابھی سے نکل کر پانی میں کھڑا ہو جاؤں۔ گاڑی چلنے لگے تو اُتر جاؤں گا۔"

"ویٹنگ روم میں آپ کے آرام کا بندوبست ہو چکا ہے۔ یہ بکس بھی وہیں رکھوا دیا جائے گا۔ جب بارش تھم جائے گی ہم چل پڑیں گے۔"

منشی نے اپنی چھتری کھول کر سر کے اُوپر لیتے ہوئے کہا

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ یہ بارش تھم جائے گی۔ میں تو امرتسر سے یہی حالت دیکھتا آرہا ہوں اور پچھلے اسٹیشنوں کے جو مسافر مجھے ملے تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ بارش دُور دُور تک ہو رہی ہے۔"

"منشی جی! آپ فکر نہ کریں آپ رات بھی ویٹنگ رُوم میں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"اور اِس مصیبت کا کیا کریں گے۔" منشی جی نے بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔

"جناب اِس کی آپ فکر نہ کریں۔ اِس سے آگے اِس بکس کو گھر پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ یہاں اسٹیشن ماسٹر بھی آپ کا خیال رکھیں گے اور ہمارا ایک آدمی آپ کے پاس موجود رہے گا۔"

منشی نے تلملا کر کہا "بے وقوف! مَیں کام کے لیے آیا ہوں۔ خدمت کروانے کے لیے نہیں آیا۔ ہم بارش ذرا کم ہوتے ہی یہاں سے چل پڑیں گے۔"

ہوا کا تیز جھونکا آیا اور منشی صاحب چھتری کے ساتھ اڑتے ہوئے چند قدم دُور چلے گئے۔ فضل دین نے اُسے بھاگ کر کلاوے میں لیتے ہوئے کہا۔ "منشی جی چھتری ہاتھ سے چھوڑ دیجیے اور آرام سے ویٹنگ رُوم میں بیٹھ جائیے۔"

منشی نے گرج کر کہا "بیوقوف اُس بکس کو کہاں رکھو گے۔"

"بکس کی فکر نہ کریں۔ منشی صاحب، وہاں میرے آدمی موجود ہیں اور اُنھیں معلوم ہے کہ اُس کے اندر کیا ہے انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر یہ بکس کسی نے اُٹھا لیا تو ہماری سب کی شامت آجائے گی۔"

"لیکن میری چھتری؟"

"جناب وہ کہیں نہیں جاسکتی۔"

تیز ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور چھتری اُلٹ گئی۔ فضل دین منشی کو سہارا دے کر ویٹنگ رُوم کے اندر لے گیا۔ ایک آدمی نے بکس ویٹنگ رُوم میں لا کر رکھ دیا اور فضل دین سے مخاطب ہو کر کہا "فضل دین یہ بہت بھاری ہے۔ منشی جی نے اس کے اندر کیا ڈالا ہے؟"

"بھئی مجھے کیا معلوم اِس کے اندر کیا ہے"۔ ہو سکتا ہے کہ گھر سے کپڑوں کے ساتھ کوئی وزنی برتن یا کوئی اور چیزیں رکھ دی ہوں۔"

منشی نے کہا "فضل دین اِس وقت کہیں سے چائے مل جائے گی۔ میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔"

"منشی جی! چائے اسٹیشن ماسٹر کے گھر سے آجائے گی اور تازہ برفی میں پاس ہی حلوائی سے لے آؤں گا۔"

"بھئی برفی ذرا زیادہ لانا مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"

"جی آپ فکر نہ کریں برفی اتنی زیادہ آئے گی کہ سب پیٹ بھر کر کھائیں گے۔ میرے گاؤں کے آدمی بھی اور قلی بھی! یوسف صاحب نے ان سب لوگوں کی تواضع کرنے کے لیے کہا تھا۔"

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد بارش ذرا کم ہوئی تو منشی نے کہا "بھئی اب یہاں سے چلو۔"

فضل دین نے کہا "نہیں منشی جی یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنے میں ہمارا فائدہ ہے۔ بھیگ تو ہم ویسے ہی گئے ہیں۔"

ایک لمبا تڑنگا سکھ ویٹنگ رُوم میں داخل ہوا اور اس نے منشی جی سے مخاطب ہو کر کہا "بھائی صاحب اگر ریلوے کی طرف سے آپ کو سہولت مل رہی ہے

تو آپ اس سے پُورا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟"

فضل دین نے منشی کے کان میں کہا "منشی جی یہ کوئی شرارتی آدمی ہے اس کے ساتھ بحث نہ کریں۔"

پھر اس نے سکھ سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا "سردار جی اگر منشی صاحب یہاں ٹھہر سکتے تو بڑی اچھی بات ہوتی لیکن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بھیگ تو گئے ہیں، رکنے سے کیا فائدہ!"

منشی نے کہا "یار اب تو اندھیرا ہو رہا ہے۔"

"آپ کو اندھیرے سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔ مسافر خانے میں چند اور آدمی اس طرف جانے والے ہیں۔ تمہارے لیے ان کے ساتھ جانا بہتر ہوگا۔"

منشی نے کہا "نہیں جی، میں کسی کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ مجھے کیا معلوم کہ ان میں سے کوئی ڈاکو نکل آئے۔"

فضل دین نے کہا "سردار جی ہمارے منشی صاحب رات کے وقت کیچڑ اور پانی میں چلنے سے گھبراتے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے اگر یہ کسی وجہ سے ناواقف لوگوں کے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتے تو ابھی سے چل پڑیں۔ مَیں کب روکتا ہوں کسی کو؟"

فضل دین نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "یار اٹھاؤ یہ بکس اور چلو۔"

ایک آدمی نے بکس اٹھا کر دوسرے کے سر پر رکھ دیا منشی اور فضل دین ان کے پیچھے چل پڑے۔

وہ کوئی ایک فرلانگ گئے ہوں گے کہ جوار کے کھیت سے اچانک تین آدمی نمودار ہوئے اور ان کے آگے چل پڑے۔

منشی شمس الدین نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُسے محسوس ہوا کہ چند آدمی اُس کے پیچھے بھی آ رہے ہیں۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"یار ڈاکو ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

فضل دین نے کہا "منشی جی اگر وہ ڈاکو ہیں تو ہمیں کیا کہیں گے۔ سامان میاں صاحب کا ہے ہم لڑے بغیر ان کے حوالے کر دیں گے۔"

منشی نے کہا: "تمہارا مطلب ہے کہ ہم بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔"

"منشی جی یہ بوجھ اٹھا کر بھاگ کون سکتا ہے؟"

منشی نے کہا "یار میاں جی نے مجھے حکم بھیجا تھا کہ میں رقم کے ساتھ چاندی کے ایک ہزار سکے بھی لاؤں۔"

"منشی جی یہ انہوں نے اس لیے کہا ہوگا کہ دیہاتی نئے سکے لے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے صرف نوٹ لے کر آنا ہوتا تو ہمارا کوئی آدمی گھوڑے پر آتا اور آپ سے رقم لے کر چند منٹ میں گھر پہنچ گیا ہوتا۔"

بکس اُٹھانے والے آدمی نے کہا "یار بوٹے میں تھک گیا ہوں، اب باقی راستہ تم یہ بوجھ اٹھاؤ۔"

دُوسرے آدمی نے بکس اُٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ اب وہ کماد اور مکئی کے کھیتوں کے درمیان پانی میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈی سے گزر رہے تھے۔ ان کھیتوں سے آگے ایک دھان کا کھیت تھا جس سے آگے کماد کے وہ کھیت تھے جو مانگا سنگھ کی حویلی سے ایک فرلانگ آگے تک نکل جاتے تھے۔

انھوں نے بمشکل دھان کا کھیت عبور کیا ہوگا کہ پچھلے کماد کے کھیت سے چار آدمی بھاگ کر آگے بڑھے اور ایک نے بلند آواز سے کہا "اگر جان بچانا چاہتے ہو تو یہیں رُک جاؤ۔"

بوٹا سنگھ بھاگ کر چند قدم آگے نکل گیا لیکن ایک آدمی نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے کہا "رُک جاؤ اور یہ بکس یہیں رکھ دو، ورنہ گولی مار دوں گا۔" بوٹا نے کہا "جی مَیں تو ایک مزدور ہوں مجھے آپ گولی کیوں مارتے ہیں۔ یہ لیجیے بکس" اور اس نے بکس اُچھال کر کھیت میں پھینک دیا۔

منشی سہمی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "جناب میری تلاشی لے لیں میں پرائے مال کے لیے نہیں مروں گا۔ میری جیب میں صرف بارہ روپے دس آنے ہیں۔"

ڈاکو نے کہا "اِدھر لاؤ بارہ روپے اور دس آنے اپنے پاس رکھ لو۔"

منشی نے اپنی جیب سے بٹوا نکال کر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب آپ خود ہی نکال لیجیے مجھے ڈر ہے کہ نمی کی وجہ سے دس کا نوٹ پھٹ جائے گا۔"

ڈاکو نے کہا "یار تم تو بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ بارہ آنے نکال لو اور بٹوہ ہمارے حوالے کر دو۔"

ڈاکو نے دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"تمہارے پاس کیا ہے؟"

"کچھ نہیں جناب میں نے برفی کی ایک ڈلی کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لی تھی لیکن اس کی حالت منشی جی کے نوٹ سے زیادہ خراب ہو چکی ہوگی۔"

"تم دونوں یہیں ٹھہرو، اور اگر ہماری اجازت کے بغیر کوئی یہاں سے ہلا تو ہم گولی مار دیں گے۔"

دوسرے ڈاکو نے جو بوٹا کے ساتھ کھڑا تھا آواز دی:

"یار ان سب کو یہاں لے آؤ۔ یہ بکس ایک مصیبت ہے۔" ڈاکوؤں کے اشارے سے وہ آگے چل دیے اور بوٹا کے گرد کھڑے ہو گئے۔

ایک ڈاکو نے پوچھا" او منشی سچ بتاؤ اس میں کیا ہے۔ یاد رکھو ابھی ہم یہ بکس کھلوا کر دیکھیں گے۔"

منشی نے جواب دیا" جناب اس میں جو کچھ ہے وہ اب آپ کا ہے میاں صاحب کے گھر سے مجھے بند بکس دیا گیا تھا مجھے صرف اتنا معلوم ہے اس میں ایک ہزار چاندی کے روپے ہیں اور کچھ کپڑے ہوں گے۔"

ڈاکو نے بوٹا کی طرف متوجہ ہو کر کہا" تم یہ بکس اٹھا لو ہم پانی سے نکل کر کسی جگہ اسے کھلوائیں گے اور اگر یہ بات غلط نکلی تو ہم منشی کا سر کاٹ کر اس بکس میں بند کر دیں گے۔"

"سرکار مجھے تو آپ کچھ نہیں کہیں گے نا؟"

"بھئی تمہیں پوری مزدوری کے علاوہ انعام بھی ملے گا۔ اب جلدی سے اس پانی سے نکلو۔ آگے کماد کی مینڈھ پر ہم یہ بکس کھلوا کر دیکھ لیں گے۔"

فضل دین نے کہا" اٹھا لو بوٹا اور سامنے کماد کے اونچے کنارے کی طرف لے جاؤ۔"

ڈاکو نے کہا" تم آگے آگے چلو ہم تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاکی کی تو ہم گولی مار دیں گے۔"

"بھائی ڈاکو جی ہمیں گولی کھانے کا کوئی شوق نہیں۔ ہم اتنے غریب ہیں کہ ہماری لاش بھی کوئی نہیں اٹھوائے گا۔"

"اچھا چلو ہم تم کو بھی انعام دیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس بکس میں کیا ہے؟"

"جناب مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ منشی کوئی رقم لے کر آ رہا ہے مجھے یہ نہیں معلوم کہ روپے کتنے ہیں اور نوٹ کتنے ہیں۔"

"اچھا ہم ابھی کھلوا کر دیکھ لیں گے۔"

فضل دین آگے آگے چل رہا تھا اور کماد کے قریب پہنچ کر مینڈھ کے ساتھ ساتھ

دائیں ہاتھ چلنے لگا۔

ڈاکو نے کہا" بس اب مینڈھ پر بکس رکھ دو ہم اسے کھلوا کر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

فضل دین نے کہا" ڈاکو جی سرکار اس طرف کھیت کا کونا بہت اونچا ہے، آپ وہاں اطمینان سے دیکھ سکیں گے۔"

"اچھا چلو ہم خود بھی مہنگا سنگھ کی حویلی سے دور رہنا چاہتے ہیں۔"

وہ کھیت کے کونے میں پہنچے تو فضل دین نے تین کھیتوں کے کونوں کے درمیان قدرے بلند جگہ پر بکس رکھ دیا۔

ایک ڈاکو نے اپنی ٹارچ جلاتے ہوئے کہا۔" اسے کھولو۔"

فضل دین نے جواب دیا: " تالا چابی کے بغیر نہیں کھلے گا۔ میں گھر سے کوئی ہتھوڑا ساتھ لے کر نہیں آیا تھا۔"

ڈاکو گرجا" او منشی کے بچے یہ تالا کھولو۔"

منشی نے جواب دیا" سرکار اس تالے کی ایک چابی امرتسر میں میاں صاحب کے گھر میں ہے اور دوسری میاں صاحب کے پاس ہے۔ میرے پاس جو پیسے تھے وہ میں نے آپ کو دے دیئے چابی کے لیے آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔"

ڈاکو نے گرج کر کہا" بے وقوف ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

فضل دین بولا" ڈاکو جی جناب منشی جی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گاؤں کے راستے میں آپ ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب آپ تسلی سے ہم سب کی تلاشی لے لیں اور ہمیں چھوڑ دیں۔"

ڈاکو نے کہا" اور یہ بکس تمہارا باپ اٹھائے گا۔"

بوٹا نے کہا" یہ بکس اتنا بھاری نہیں جناب میں اسے پچھلے کھیتوں تک

اپنے سر پر اُٹھا کر لایا ہوں۔"

ڈاکو نے کہا۔"تم بکواس نہ کرو، ہم یہ بکس کھلوائیں گے ورنہ تم سب کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔"

منشی نے کانپتے ہوئے کہا۔"جناب ڈاکو صاحب میں بوڑھا آدمی ہوں میری ہڈیاں توڑنے کی بجائے آپ اِس بکس کو کیوں نہیں توڑ ڈالتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے بھی یہ تالا توڑ سکتے ہیں۔"

ڈاکو نے جھک کر ایک ہاتھ سے تالا توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے غضب ناک ہو کر بولا۔"ایک منٹ کے اندر اندر چابی نکالو اور تالا کھول دو، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو گولی مار کر یہیں پھینک جائیں گے۔"

بوڑھا چلایا"سرکار میں ان کا ساتھی نہیں ہوں۔ میں مسلمان بھی نہیں ہوں، ایک غریب عیسائی ہوں، مجھے گولی مار کر آپ کیا لیں گے، مجھے جو ایک روپیہ مزدوری ملتی تھی وہ آپ منشی صاحب کے حساب سے کاٹ لیں۔"

"بیوقوف منشی صاحب کو ایک منٹ کے اندر اندر سارا حساب بھول جائے گا۔"

فضل دین نے کہا"ایسا نہ کیجئے جناب اگر منشی صاحب حساب بھول گئے تو ہمیں پچھلے مہینے کی تنخواہ کون دے گا؟"

قریب ہی سے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ اِس کے ساتھ ہی تین آدمی بھونکتے ہوئے کتوں کی رسیاں پکڑے ہوئے نمودار ہوئے۔

ڈاکو بدحواس ہو کر پیچھے ہٹے تو چند اور کتے بھونکتے ہوئے پیچھے مکئی کے کھیت سے نکلے اور وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

پھر ایک سرپٹ گھوڑ سوار بائیں طرف سے کیچڑ اور پانی میں نمودار ہوا اور آن کی آن میں دھان کا کھیت عبور کرنے کے بعد اُن کے قریب آ پہنچا۔

انہوں نے دائیں ہاتھ نہر کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن اُدھر سے پستول چلنے کی آواز سنائی دی اور آن کی آن میں ایک اور گھوڑ سوار نمودار ہوا اور اُس نے آواز دی:"تم اس وقت چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو، اپنے ہتھیار پھینک دو، ورنہ سب مارے جاؤ گے۔"

اِس کے ساتھ ہی چاروں اطراف سے انہیں ٹارچوں کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ ایک ڈاکو نے سوار کی طرف بندوق چلانے کی کوشش کی، لیکن کسی نے کماد کے کھیت کے کنارے سے فائر کیا گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور ڈاکو نے اپنی بندوق پھینک دی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنی تلواریں اور برچھیاں پھینک دیں۔

فضل دین نے جلدی سے ایک ڈاکو کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔صاحب جی اس ڈاکو کے پاس ایک چھوٹا سا پستول بھی ہے۔ کرتے کی جیب کے اندر، دوسروں کو بھی اچھی طرح دیکھ لیں۔ ان کے پاس چھرے بھی ضرور ہوں گے۔"

بندوق چلانے والا آگے بڑھا اور ایک آدمی جس نے بڑی مشکل سے ایک خونخوار کتے کو تھام رکھا تھا۔ بیلا سنگھ تھا جس کا آدھا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

سوار جو سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب آ چکا تھا۔ یوسف تھا۔

بیلا سنگھ نے ایک آدمی سے ٹارچ لے کر ڈاکوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"اگر تمہارے کوئی ساتھی کماد کے اندر چھپے ہوئے ہیں تو انہیں آواز دے کر بلا لو ورنہ چند خونخوار کتے چھوڑ دیے جائیں گے اور وہ ان کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔"

ایک منٹ بعد ڈاکوؤں کو ہتھکڑیاں لگائی جا رہی تھیں۔ فضل دین نے کہا"سردار جی اپنے آدمیوں کو آواز دیں کہ وہ کتے چھوڑ دیں۔ میرا خیال ہے کہ پیچھے مکئی کے کھیت میں ان کے کوئی اور ساتھی بھی موجود ہوں گے۔"

بیلا سنگھ نے آواز دی"اُدھر مکئی کے کھیت میں کتے چھوڑ دو، ہمیں دشمن

کرتا ہوں ۔"

بیلا سنگھ کے آدمیوں کے ساتھ بہادر سنگھ اُس طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد مکئی کے کھیت کی طرف کتوں کے بھونکنے کے ساتھ دو آدمیوں کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بیلا سنگھ بھاگ کر آگے بڑھا اور اُس نے مکئی کے کھیت کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا "کتوں کو روکے رکھو لیکن ڈاکوؤں کو اپنے گھیرے سے باہر نہ نکلنے دو" بلو کی آواز سنائی دی۔ "سردار جی اب یہ نہیں نکل سکتے۔"

تھوڑی دیر بعد دو آدمی جنکی گردنیں بہادر سنگھ اور بیلا سنگھ نے دبوچ رکھی تھیں۔ مکئی کے کھیت سے نمودار ہوئے۔ کُتے جن کی رسیاں سردار بیلا سنگھ کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھیں ان پر جھپٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہادر سنگھ اپنی بندوق کے ساتھ اور بلو اپنی برچھی تانے ناچتا ہوا ان کے پیچھے آرہا تھا۔ جب دھان کے کھیت میں داخل ہوئے اور ٹارچ کی روشنی ان کے چہرے پر پڑنے لگتی تو بلو ان کے گرد چکر لگانے کے بعد بھاگ کر برچھی تانے آگے بڑھتا لیکن جب برچھی ان کے جسم کے کسی حصے کو چھونے لگتی تو وہ اپنا ہاتھ روک لیتا۔ ڈاکو خوف سے چیختے ہوئے کبھی اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں اور کہنیوں میں چھپا لیتے تھے اور کبھی کیچڑ میں گر پڑتے تھے۔ دیکھنے والے قہقہے لگا رہے تھے۔

یوسف نے اپنا گھوڑا آگے کرتے ہوئے کہا " بلو بھئی اب یہ ناچ ختم کرو۔ تھک جاؤ گے، ابھی ہمیں بہت کام ہے۔ اگر موقع ملا تو پولیس کے بڑے افسروں کے سامنے تمہارے کرتب دیکھے جائیں گے۔" پھر وہ بیلا سنگھ کی طرف متوجہ ہوا۔

" چچا اس دن بھی بلو اسی طرح ناچ رہا تھا۔ جب میں نے بندوق سے پردیسی درخت پر بلا مار ڈالا تھا۔"

بیلا سنگھ نے پریم سنگھ سے کہا " پریم سنگھ اب بارش رک گئی ہے۔ میرا خیال ہے

ہمیں تھوڑی دیر سردار مہنگا سنگھ کی حویلی میں ٹھہر جانا چاہیے۔ وہاں آپ سب کے لیے گرم گرم چائے تیار ہوگی۔ اگر مناسب ہو تو آپ ڈاکوؤں کو تھانے لے جانے کے لیے پولیس کے اور آدمی منگوا لیں۔"

بہادر سنگھ نے کہا " نہیں سردار جی پولیس کے اور آدمیوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکوؤں کو ہم اسی طرح ہانکتے ہوئے لے جائیں گے۔ بھائی یوسف جی! آپ تھک گئے ہوں گے۔ سیدھے گھر جائیں اور ہمیں بھی چائے اس وقت مزا دے گی جب ہم ڈاکوؤں کو حوالات میں بند کر دیں گے۔"

پریم سنگھ نے کہا " ہاں یوسف صاحب بہادر سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ آپ سردار مہنگا سنگھ کے نوکر سے کہتے جائیں کہ ہم اس کی چائے پھر کسی دن پی لیں گے۔"

یوسف نے کہا "ٹھیک ہے لیکن میں جانے سے پہلے آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

پریم سنگھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور چند قدم دُور جا کر کہا " یوسف جی فرمائیے کیا حکم ہے۔"

" حکم نہیں بھائی صاحب ایک مشورہ ہے۔"

حوالدار نے کہا " جناب ہمیں تمام بڑے افسروں کا حکم ہے کہ آپ کے مشورے کو حکم سمجھا جائے۔"

یوسف نے کہا " اچھا تو جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ تھانیدار اور انسپکٹر کے کانوں تک پہنچا دو کہ یہ کیس بڑے افسروں کے سامنے اور دینا ناتھ کی موجودگی میں کھولا جائے۔ میاں عبدالکریم کے پاس اس کی ایک چابی ہوگی وہ صبح لیتا آؤں گا شاید میاں عبدالکریم خود بھی وہاں آجائیں۔"

پریم سنگھ نے کہا " جناب آج جو کچھ ہوا ہے اُس کی بہت سی باتیں ہماری

سمجھ سے باہر ہیں۔ لیکن آپ سب انہیں سمجھتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جو باتیں پولیس
کے لیے جاننا ضروری ہیں وہ مجھے بتا دیں یا آپ ایک مفصل رپورٹ لکھ کر اپنے ساتھ
لے آئیں۔ رپورٹ اس لیے بہتر ہو گی کہ جو بات آپ کہیں گے وہ پولیس کی سمجھ میں
جلدی آجائے گی۔"

"میں کوشش کروں گا۔ شاید اس کی ضرورت بھی ہو۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام
ہے کہ دینا ناتھ کو کس طرح سے بلایا جا سکتا ہے۔"

پریم سنگھ نے بہادر سنگھ کو آواز دی۔ "بہادر سنگھ ذرا اِدھر آؤ۔"

بہادر سنگھ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور پریم سنگھ بولا۔ "بہادر سنگھ یوسف صاحب
چاہتے ہیں کہ تھانے میں یہ کیس سیٹھ دینا ناتھ کی موجودگی میں کھولا جائے مجھے یقین
ہے کہ ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی انسپکٹر، ڈی ایس پی اور شاید
ایس پی صاحب بھی صبح تھانے پہنچ جائیں۔ اَب تم بتاؤ کہ دینا ناتھ کو صبح بلانے کا
کیا طریقہ ہے؟"

بہادر سنگھ نے جواب دیا۔ "کوئی خاص طریقہ نہیں جناب آپ ابھی اپنے
ایک سپاہی کو بھیج دیں کہ صبح پولیس کے کوئی بڑے افسر تھانے میں علاقے کے معتبرین
سے ملنا چاہتے ہیں۔

سردار بیلا سنگھ اُسے اپنے گاؤں سے کوئی گھوڑی دے دیں گے اور جب
وہ دینا ناتھ کے گھر پہنچ کر یہ بتائے گا کہ مجھے شام سے کچھ دیر پہلے یہ حکم ملا تھا اور
میں بس معتبر آدمیوں کے ساتھ دیہات کا چکر لگانے کے بعد یہاں پہنچا ہوں
تو آپ دیکھیں گے کہ اُسے باقی رات نیند نہیں آئے گی۔ اگر یوسف صاحب
کے گاؤں کا چوکیدار بیراں دتہ بھی اُس کے گھر یہ پیغام پہنچا دے کہ تھانیدار صاحب
کا حکم آیا ہے تو بھی وہ حاضر ہو جائے گا۔"

پریم سنگھ نے جواب دیا "کہ اِس حالت میں تو وہ اور زیادہ جلدی کرے گا۔
اِس علاقے میں کوئی واردات اِس کے علم کے بغیر نہیں ہوتی اور یہ جاننا اس کے لیے
بہت ضروری ہو گا کہ چھ اور ڈاکو گرفتار کیسے ہو گئے اور اُن میں سے ایک کے متعلق
تو مجھے بلو نے بتایا ہے کہ وہ دینا ناتھ کے اپنے گاؤں کا آدمی ہے۔"

یوسف نے پوچھا "تم نے اس کے گاؤں کے آدمی کو پہچان لیا ہے؟"

"جناب اُسے بلو اور سردار بیلا سنگھ کے ایک ساتھی نے اچھی طرح
پہچان لیا ہے۔"

سردار جی کے کُتے نے اُسی کی ٹانگ سے تھوڑا سا گوشت نوچا تھا۔

"اُسے پٹی کی ہے؟"

"جی بلو نے اُسی کی پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھ دی تھی وہ یہ کہتا تھا کہ زخم پر
تھوڑی سی سرخ مرچیں چھڑک دی جائیں تو یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا اور اُسے
باؤلا ہونے کا بھی خطرہ نہیں رہے گا۔"

یوسف نے کہا "نہیں نہیں جوالدار صاحب آپ جاتے ہی اُس کے لیے
ٹیکے کا انتظام کریں اگر کتوں نے کسی اور آدمی کو کاٹا ہے تو اُسے بھی ٹیکے لگوانے
پڑیں گے۔"

بیلا سنگھ نے آگے بڑھ کر کہا "یار دیکھنا کہیں میرے کتوں کو نہ مار دینا کوئی ان بدمعاشوں
کے حصے کے ٹیکے میرے کتوں کو نہ لگا دے۔

بہادر سنگھ نے کہا "نہیں سردار جی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کتوں کے ٹیکے آدمیوں
کو نہیں لگائے جاتے۔ ویسے آپ کے کتے بہت قیمتی ہیں۔ اِس لیے ہر سال انہیں
ٹیکے ضرور لگا دینے چاہئیں۔"

یوسف نے کہا "سردار جی بہادر سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ اِس علاقے میں اپنے کتوں

کو ٹیکے لگوانے اور آوارہ کتوں کو مارنے کا انتظام کریں۔"

بیلا سنگھ نے کہا "نا بابا ایسا نہ کرنا۔ جب ہیلتھ آفیسر صاحب کے آدمی آئیں گے تو یہاں سے کوئی بدمعاش انہیں میرے گھر بھیج دیگا۔"

یوسف نے کہا "نہیں سردار جی میں خود ہیلتھ آفیسر کے پاس جا کر اس بات کا بھی بندوبست کر دوں گا کہ آپ کے کتے محفوظ رہیں۔ اب اگر آپ بھی نو بجے کے قریب تھانے پہنچ جائیں تو اچھا ہوگا۔"

بیلا سنگھ نے کہا "وہ کس لیے، ہم نے جو کام کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔"

"سردار جی وہ اس لیے کہ وہاں بڑا اشکار موجود ہوگا۔ بہادر سنگھ آپ کے ساتھ جائے گا اور رات آپ کے پاس رہے گا۔ صبح میں اپنے گاؤں کے چوکیدار پیراں دتہ کو بہادر سنگھ کے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ اسے ایک گھوڑی دے دیں۔ تاکہ یہ میرے گاؤں کا چکر لگانے کے بعد سیدھا وہاں سے پنڈت دینا ناتھ کی ملاقات کے لیے چلا جائے۔"

بیلا سنگھ نے کہا "گھوڑی تو میں دے دوں گا مگر میں پنڈت دینا ناتھ سے اس کی ملاقات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

سردار جی جب آپ اطمینان سے کھانا کھا کر بیٹھیں گے تو بہادر سنگھ آپ کو بہت کچھ بتا سکے گا۔ اور جو باتیں اسے معلوم نہیں وہ تھانے میں آپ پر ظاہر ہو جائیں گی۔"

بیلا سنگھ نے عاجز ہو کر کہا "یار یہ پڑھے لکھے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ یوسف جی مطلب یہ ہے کہ مجھے آج رات بھی آرام سے نیند نہیں آئے گی۔ آخر وہ کیا بات ہے، جو مجھ سے چھپانا ضروری ہے؟"

یوسف نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: "چچا ہو سکتا ہے کہ بہادر سنگھ اگر ساری نہیں تو کم از کم اتنی باتیں ظاہر کر دے کہ آپ آرام کی نیند سو سکیں۔ حوالدار صاحب آپ پولیس اسٹیشن پہنچ کر میرے آدمیوں کو چھٹی دے دیں۔ صبح اگر آپ

نے ضرورت محسوس کی تو یہ حاضر ہو جائیں گے۔"

پریم سنگھ نے کہا "یوسف صاحب میں شہر کے قریب پہنچتے ہی فضل دین اور بلو کے سوا آپ کے تمام آدمی واپس بھیج دوں گا۔ اگر انہیں چند گھنٹے ٹھہرنا ضروری ہوا تو ان کے آرام کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا۔ آپ گھر جا کر آرام کریں اور بھگوان کے لیے رپورٹ لکھنا نہ بھولیے گا یہ ہو سکتا ہے کہ ایس پی صاحب خود وہاں پہنچیں اور ہماری الٹ پلٹ باتیں سن کر خفا ہو جائیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ چچا بیلا سنگھ مجھے اجازت ہے؟"

"ہاں بھئی جاؤ۔"

یوسف نے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے ایڑ لگائی آن کی آن میں پانی سے بھرے ہوئے کھیتوں میں اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی

باب ۔ ۱۳

اگلے دن نو بجے کے قریب تھانے میں اچھا خاصا میلہ لگا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل تیر رہے تھے اور نمی سے لدی ہوئی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔

یوسف گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا۔ ایک کانسٹیبل نے بھاگ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور وہ سیدھا تھانے دار کے کمرے میں چلا گیا۔ تھانے دار اُس سے بغل گیر ہو کر ملا اور بولا "یوسف صاحب انسپکٹر صاحب نے ٹیلی فون پر پورے تھانے کو ہی کارگزاری پر مبارک باد دی ہے وہ کہتے تھے کہ ایس پی صاحب بہت خوش ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ خود یہاں تشریف لائیں اور آپ کو ملاقات کے لیے بلالیں۔ ورنہ آپ کو ان کے پاس گورداسپور جانا پڑے گا۔ انسپکٹر صاحب تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ جائیں گے حوالدار نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے مشورے دینا ناتھ کو دس بجے کے قریب یہاں پہنچنے کا پیغام بھیج دیا گیا ہے۔"

یوسف نے کہا "آج موسم خوش گوار ہے۔ آپ کرسیاں کسی ایسی جگہ ڈلوائیں جہاں سے حوالات کے اندر ڈاکو ہمیں اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اگر ضرورت پڑی تو حوالات سے چند آدمیوں کو باہر لانا پڑے گا۔ آپ کو دینا ناتھ کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آنا چاہیے اور حوالات کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی زریں خدمات کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

تھانے دار نے کہا "یوسف صاحب ہمیں حکم ہے کہ آپ کے ہر مشورے پر سوچے بغیر عمل کیا جائے لیکن یہ معما اگر آپ تھوڑا سا حل کر دیتے تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی۔"

یوسف نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ تھوڑی دیر میں سارے معمے حل ہو جائیں گے۔"

حوالدار نے آگے بڑھ کر کہا "یوسف صاحب آپ کا آدمی اور شاید پنڈت دینا ناتھ بھی ان کے ساتھ آ رہا ہے۔"

یوسف نے سب انسپکٹر سے کہا "بیلا سنگھ بھی آ رہا ہے وہ ایک بہادر آدمی ہے اور عزت کا مستحق ہے۔ میں تھوڑی دیر اپنے آدمیوں کے ساتھ بات کر کے آتا ہوں۔"

یوسف تیز چلتا ہوا آگے بڑھا اور کچھ دیر تھانے کے پھاٹک کے قریب اپنے گاؤں کے آدمیوں سے باتیں کرتا رہا۔ اتنی دیر میں موٹر سائیکل کی آواز آئی اور سڑک کے کنارے کھڑے ایک کانسٹیبل نے آواز دی "انسپکٹر صاحب آ رہے ہیں۔"

انسپکٹر تھانے کے احاطے کے اندر داخل ہو کر رکا اور موٹر سائیکل سے اتر کر اس نے یوسف کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اُس کے ساتھ باتیں کرتا اور اشاروں سے آس پاس کھڑے لوگوں کے سلام کا جواب دیتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد دینا ناتھ اپنی سست رفتار بھاری بھرکم گھوڑی پر سوار نمودار ہوا۔ تھانیدار کے اشارے پر ایک سپاہی نے بھاگ کر گھوڑی کی لگام پکڑ لی اور دینا ناتھ کو اترنے کے لیے سہارا دیا۔ تھانیدار نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ سیٹھ جی انسپکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک آپ سے ملاقات کریں گے۔ انھوں نے مجھے ٹیلی فون پر کہا تھا کہ ڈاکوؤں کے نئے گروہ کی گرفتاری کے سلسلے میں سیٹھ جی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔ آپ اُس طرف کرسی پر تھوڑی دیر کے لیے

بیٹھ جائیں۔ پریم سنگھ انہیں وہاں بٹھا دو۔"

دینا ناتھ حوالدار کے ساتھ چل دیا اور پریشانی کے عالم میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "سردار پریم سنگھ جی انسپکٹر صاحب سے کسی نے شکایت تو نہیں کی؟"

"سیٹھ جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انسپکٹر صاحب جی اچھے کو اچھا برے کو برا سمجھتے ہیں اور سچ بات ظاہر کرنے سے بھی کبھی نہیں جھجکتے۔"

دینا ناتھ نے کہا "یار حاکموں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ میں تو تھانے پہنچنے کا حکم سن کر ہی ڈر گیا تھا۔"

"پنڈت جی وہ کانسٹیبل جو آپ کے پاس گیا تھا، بہت سمجھ دار ہے اگر اس نے آپ سے کوئی گستاخی کی ہے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔"

"نہیں تھانیدار صاحب وہ تو بہت ہی شریف لڑکا ہے اور ساتھ والے گاؤں کا چوکیدار پیراں دتہ جو ان کے ساتھ آیا تھا وہ بھی بہت اچھا آدمی ہے۔"

پیچھے سے بہادر سنگھ نمودار ہوا اور اس نے قریب آکر کہا۔ "پنڈت جی جب افسر اچھے ہوتے ہیں تو ماتحت بھی اچھے ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے انسپکٹر صاحب سے مل کر زیادہ خوش ہوں گے۔"

سردار بیلا سنگھ گھوڑا دوڑاتا ہوا احاطے میں داخل ہوا۔

ایک سپاہی نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بہادر سنگھ بھاگ کر آگے بڑھا اور اس نے بیلا سنگھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"چچا جی۔ آئیے بیٹھیں انسپکٹر صاحب تھوڑی دیر تک آپ سے ملاقات کریں گے۔"

بیلا سنگھ اس کے ساتھ آگے بڑھا اور دینا ناتھ کے قریب سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

یہ ایک بکری کے ساتھ شیر کو بٹھانے والی بات تھی اور بہادر سنگھ بڑی مشکل سے مسکراتے ہوئے دانت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیلا سنگھ اسے بری طرح گھور رہا تھا۔ لیکن دینا ناتھ نے اس کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا وہ چاہتا تھا کہ دوسری طرف منہ موڑ لے لیکن اس طرف حوالات کی سلاخوں سے ڈاکو اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔



تھانے کے ایک کمرے میں جب انسپکٹر عبدالعزیز اور یوسف کے درمیان گزشتہ رات کے واقعات پر گفتگو شروع ہوئی تو یوسف نے اسے ایک لفافہ پیش کرتے ہوئے کہا "جناب میں اس بات پر معذرت خواہ ہوں کہ میں نے دو دن قبل آپ کو گزشتہ رات کے متوقع واقعات کے متعلق نہیں بتا دیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ مسئلہ میرے قیاس تک محدود تھا۔ اور یہ ہو سکتا تھا کہ میرا قیاس سراسر غلط ثابت ہوتا تو میرا مذاق اڑایا جاتا۔ آپ یہ مختصر سی رپورٹ جو میں نے رات کے وقت لکھی تھی پڑھ لیجئے۔ پھر اس سلسلے میں شاید آپ کو کوئی مزید سوالات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔"

انسپکٹر عبدالعزیز نے مسکراتے ہوئے لفافے سے چند فل سکیپ سائز کے کاغذات نکال کر غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یوسف میز پر سے اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا اور کوئی دس منٹ تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔

انسپکٹر نے کاغذ تہ کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا "اگر ہمارے ایس پی صاحب اردو پڑھ سکتے تو وہ آپ کو بڑے سے بڑے انعام کا مستحق سمجھتے۔ اب میں انگریزی میں ترجمہ کر کے انہیں پیش کروں گا اور میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری ملاقات زیادہ ضروری ہو جائے گی۔ آپ سے کئی سوال پوچھے جائیں گے اور اگر آپ کے جوابات اس تحریر کی طرح

موثر ہوئے تو ایس پی صاحب آپ کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے اور میری طرح
ان کی رائے بھی یہ ہوگی کہ ہماری پولیس کو آپ جیسے ہونہار نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

یوسف نے کہا" جناب میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ میری زندگی کے کسی پروگرام کا
حصّہ نہیں۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ چلتے چلتے میرے راستے میں ایک خطرناک موڑ آیا تھا اور
اللہ کے کرم سے میں بے خوف و خطر اُس سے بچ کر نکل گیا۔"

عبدالعزیز نے کچھ دیر سوچ کر کہا" یوسف بیٹا تمھیں آج سے مجھے پولیس افسر کی
بجائے اپنا دوست سمجھنا چاہیے اور اس بات پر کبھی حیران نہیں ہونا چاہیے کہ مجھے تمھاری
زندگی کے ہر موڑ سے دل چسپی ہوگی۔"

"شکریہ چچا جان مجھے آپ ناشکر گزار نہیں پائیں گے۔"

"اور جن لوگوں کو تمھارے مشورے سے یہاں بلوایا گیا ہے۔ اُن کے متعلق ایس آئی
نے میرے ساتھ مفصل گفتگو کی تھی اور میں بہت سی باتیں سمجھ گیا ہوں۔ اس کیس کو دینا ناتھ
کے سامنے کھولنے کا معما مجھے آپ کی رپورٹ پڑھ کر سمجھ میں آیا ہے لیکن ان لوگوں
سے ملاقات کرنے سے پہلے میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے
کہ تم نے اپنی بہادرانہ کارگزاری سے کئی دشمن پیدا کر لیے ہیں اور کئی تمھارے حاسد بھی
ہو سکتے ہیں۔ میں تمھیں پورے ملک کے لیے بندوق اور پستول کا لائسنس دلوا دوں گا۔
میرا خیال ہے کہ ایس پی صاحب خود بھی آپ کو ذاتی حفاظت کے لیے اسلحہ بطور انعام
دینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کو کوئی ایسی پیش کش قبول
نہیں کرنی چاہیے۔ جب سے آپ کا پولیس کے ساتھ کوئی تعلق بھی ریکارڈ میں آجاتے۔
میں یہ بھی مشورہ دوں گا کہ تعلیم کے دوران آپ کسی نئے کیس میں اُلجھنے کی کوشش نہ
کریں۔ ایس پی صاحب اگر کسی انعام کی پیش کش کریں تو ادب سے انکار کر دیں۔ اس طرح اُن
کے دل میں آپ کی عزت اور بڑھ جائے گی۔"

یوسف نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا" چچا جی میرا اپنا فیصلہ بھی یہی تھا کہ میں
کوئی انعام قبول نہیں کروں گا۔ اگر ریوالور کا لائسنس مل جاتے تو میں خرید سکتا ہوں لیکن مجھے
اُن لوگوں کے متعلق بہت تشویش رہے گی جو میری وجہ سے ڈاکوؤں کی نظر میں آچکے ہیں۔
اِن بدمعاشوں کے متعلق میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جس قدر لوگوں کو اپنے اسلحہ سے
ڈرانا پسند کرتے ہیں اسی قدر زیادہ دوسروں کے اسلحہ سے ڈرتے بھی ہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا" تم ابھی ان کے نام لکھوا دو انھیں کسی دن بہت جلد ایس پی صاحب
کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔"

یوسف نے کہا" میرے گاؤں سے سب سے پہلے بگّو کا نام لکھ لیجیے۔ دوسرا بوٹا
عیسائی ہے۔ یہ دونوں اپنے وسائل سے بندوق کبھی نہیں خرید سکتے۔ تیسرا پیراں دتّہ
چوکیدار ہے اور وہ ایک لحاظ سے حکومت کا ملازم بھی ہے۔ اُس کو بھی بندوق مل جائے تو
اچھا ہوگا۔ ہمارے خاندان سے صرف تین آدمی ایسے ہیں جو لائسنس حاصل کرنے کی خواہش
رکھتے ہیں اور اسلحہ اپنی جیب سے خرید سکتے ہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا" آپ اُن کی طرف سے درخواست لکھ کر مجھے بھجوا دیں۔"

یوسف نے کہا" میاں عبدالکریم کے پاس پستول ہے۔ ان کے ایک نوکر فضل دین
کو بندوق کے لائسنس کی ضرورت ہوگی اور وہ اُسے خریدنے کے لیے پیسے بھی دے
دیں گے۔

اُن کے گاؤں کا دوسرا آدمی جس کی میں پُرزور سفارش کرتا ہوں۔ اُس کے لیے
جب آپ عبدالکریم سے بات کریں تو علیحدگی میں پوچھیں کہ وہ اُسے بندوق خرید کر
دینا پسند کریں گے یا حکومت کی طرف سے بندوق بطور انعام مل جائے تو وہ کوئی اور
انعام دے دیں گے۔ میں نے جن لوگوں کے نام لیے ہیں وہ علاقے کے امن کے لیے

بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔

ہردیال سنگھ کے بیٹے جگجیت سنگھ کی عمر بہت چھوٹی ہے۔ لیکن وہ اگر ہوش اور عقل سے کام نہ لیتا تو ہمیں یہ دونوں کامیابیاں حاصل نہ ہوتیں۔"

عبدالعزیز مسکرایا "اُس کے متعلق جو آپ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اسے گورنمنٹ کے خرچ پر تعلیم دلوائی جائے اور اِس کے بعد پولیس میں لے لیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ سردار بیلا سنگھ کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وُہ ایک چھوڑ کر دو چار بندوقیں خرید سکتے ہیں لیکن اُن کو صرف کتّوں کا شوق ہے۔ وہ بڑے بہادر اور کارآمد آدمی ہیں اسلحہ کے سلسلہ میں آپ خود ان سے بات کریں تو وہ بہت خوش ہونگے۔ اپنی رپورٹ میں مَیں پریم سنگھ حوالدار اور بہادر سنگھ کانسٹیبل کی کارگزاری کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو آگے چل کر وہ اچھے افسر ثابت ہوں گے۔"

"ان دونوں کی سفارش کردی جائے گی اور بہادر سنگھ کو ترقی دے کر اِس تھانے میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ آپ اُن دونوں کو یہ خوش خبری دے سکتے ہیں۔"

"چچا جی، یہ خوش خبری اگر آپ کی طرف سے ہو تو بہتر ہے۔ اب آپ باہر کھلی ہوا میں ان سے ملاقات کریں اور وہیں اس بکس کا تالا کھلوائیں۔ عبدالکریم صاحب اپنے ساتھ چابی لے آئے ہوں گے۔ روپے گننے کے لیے دینا ناتھ کو کہیں، کرسیاں اُس جگہ رکھوا دی گئی ہیں۔ جہاں سے حوالات کے قیدی اچھی طرح دیکھ سکیں۔ آپ جس قدر دینا ناتھ کے ساتھ تپاک سے ملیں گے۔ اُسی قدر وہ پریشان ہوگا۔"

عبدالعزیز نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ دینا ناتھ کو گرفتار کرلیا جائے۔ کیونکہ اِس بکس کو کھولنے کے بعد ثبوت ہمارے پاس کافی ہو جائیں گے اور شاید

گرفتار ہونے والے ملزموں میں سے کوئی اُس کے خلاف گواہی بھی دے دے۔"

یوسف نے کہا "جناب میں اُس کی گرفتاری کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ویسے آپ مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُسے عزت سے رخصت کیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ علاقے میں چوروں اور بدمعاشوں کا بڑا اڈہ ختم ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور اُس کی قدرتی سزا آج کے دن سے شروع ہو جائے گی۔ باہر ملاقات کرنے والے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

آسمان ابر آلود ہے اور بڑی خوشگوار ہوا چل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ چند منٹ میں فارغ ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی اس ڈرامے میں میرا ذاتی پارٹ ختم ہو جائے گا اور میں اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے سکوں گا۔"

انسپکٹر نے کہا "بیٹا یوسف میں خود یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو ایسی الجھنوں کا دوبارہ سامنا کرنا پڑے۔ ایک بات سے مَیں بہت خوش ہوں کہ تم مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔ لیکن گزشتہ واقعات کے بعد یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو تم اپنے آپ کو بہترین نشانہ باز ثابت کرسکو۔ تمہیں نشانہ کی مشق کروانے کے لیے کسی ماہر استاد کی خدمات حاصل کرنا ہماری اولین ذمہ داری ہے مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہترین نشانہ باز بننے کے لیے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اب میرے ساتھ تمہارا یہ معاہدہ ہونا چاہیے کہ تمہیں جب فرصت ملا کرے گی تم ہیڈ کوارٹر میں میرے پاس آیا کرو گے اور میں بھی کبھی کبھی چلتے پھرتے تمہارے ہاں پہنچ جایا کروں گا۔ شاید ابھی تم یہ نہ سمجھ سکو کہ میں تم سے اس قدر مانوس کیوں ہو گیا ہوں۔ لیکن کسی دن ہم ایک دوسرے کے لیے معمّا نہیں رہیں گے۔"

"چچا جان میرا خیال ہے کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے لیے معمّا نہیں ہیں۔"

"سنو بیٹا ایک بات میں تمہیں بتا ہی دوں کہ میں زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہوں گا
ایس پی صاحب یہاں سے تبدیل ہو کر جا رہے ہیں اور وہ اپنی تبدیلی سے پہلے ہی مجھے
اُس جگہ بھیج دیا کرتے ہیں جہاں انھیں تبدیل ہو کر جانا ہوتا ہے۔

ہم دس گیارہ برس سے ساتھی چلے آرہے ہیں۔ وہ اس بات پر بہت خوش
تھے کہ تمہاری وجہ سے اس ضلع میں ان کے سروس ریکارڈ میں بہت بڑے کارنامے کا
اضافہ ہوا ہے۔ وہ اتنے کھلے دل کے آدمی ہیں کہ اگر کسی دن گھوڑے پر سوار ہو کر تمہارے
گاؤں کی طرف نکل آئیں تو بھی مجھے تعجب نہیں ہوگا۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور تھانے دار نے اندر آکر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگانے
کے بعد انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"سر ایس پی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

انسپکٹر نے ریسیور پکڑ کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن سر۔ سر یہ دونوں ڈاکے ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا لیڈر
ارجن سنگھ تھا۔ سر مسٹر یوسف نے بڑی تفصیل کے ساتھ تمام واقعات لکھ دیئے ہیں۔ جو
آپ دلچسپی سے پڑھیں گے اور اس کا ترجمہ شام تک آپ کی خدمت میں پیش
کر دوں گا۔

سر مسٹر یوسف اِس وقت میرے پاس بیٹھے ہیں اور ڈاکوؤں کی گرفتاری کے
ساتھ تعلق رکھنے والے تقریباً تمام لوگ باہر بیٹھے ہوتے ہیں ـــ میں یہاں سے فارغ
ہوتے ہی ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤں گا ـــ سر میں پانچ بجے آپ کے بنگلہ پر حاضر ہو
جاؤں گا ـــ سر اگر یہ ممکن ہو سکے تو یوسف اور اِس کے گاؤں کے لوگ اسے اپنی عزت
افزائی سمجھیں گے۔

لیکن ان دنوں گاؤں میں کار لے کر جانا بہت مشکل ہوگا۔ یہاں سے ہمیں تقریباً

دو میل پیدل چلنا پڑے گا ـــ

بہت اچھا سر۔ جس دن آپ مناسب سمجھیں گے۔ اسے بلا لیا جائے گا۔
سر میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ وہ جب چاہے آپ سے مِل سکتا ہے۔

انسپکٹر نے ریسیور رکھ دیا اور تھانیدار سے مخاطب ہوا۔ "آپ ملاقاتیوں
سے کہہ دیں کہ میں اُٹھ کر ان کے پاس آنے والا تھا کہ ایس پی صاحب کا فون آگیا۔
ایس پی صاحب اِس بات پر خوش ہیں کہ پنڈت دینا ناتھ جیسے بااثر لوگ اس کیس
میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ بکس وہاں رکھوا دو اور اگر میاں عبدالکریم کے پاس اس کی چابی
موجود ہے تو اُسے کھلوا دو۔ ورنہ تالہ تڑوا دو اور پنڈت دینا ناتھ سے کہو کہ وہ روپے
گننا شروع کر دے میں یوسف صاحب کے ساتھ ابھی آتا ہوں۔"

تھانیدار کمرے سے باہر نکل گیا اور انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یوسف صاحب
آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ ایس پی صاحب مجھ سے کیا باتیں کر رہے تھے، وہ کل تمہارے
گاؤں آنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہہ دیا ہے کہ راستہ خراب ہے اب وہ کسی دن فرصت
کے وقت آپ کو بلائیں گے لیکن انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ جب چاہیں اُن سے
مِل سکتے ہیں۔

یوسف نے کہا "چچا جان مجھے آپ یوسف صاحب کیوں کہتے ہیں۔ صرف یوسف
کیوں نہیں کہتے؟"

"اچھا یوسف ما چلو تمہارے ڈرامے کا اہم ترین سین بھی دیکھ لیں وہ باہر نکلے تو
دائرہ میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے درمیان چٹائی بچھا کر اس کے اُوپر بکس رکھا جا رہا تھا،
انسپکٹر یوسف کے ساتھ باتیں کرتا ہوا آگے بڑھا اور وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

انسپکٹر نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور دینا ناتھ کے ساتھ زیادہ گرمجوشی
دکھانے کے بعد کہا۔

"سیٹھ جی آپ کو تکلیف ہوئی، میں چند ضروری کاغذات دیکھنے کے بعد آپ کے پاس آنے والا تھا۔ کہ ایس پی صاحب کا فون آگیا۔ وہ پولیس کے ساتھ آپ جیسے باأثر لوگوں کے تعاون سے بہت خوش نظر آتے تھے۔ انسپکٹر عبدالعزیز کی آواز حوالات تک پہنچ رہی تھی اور دینا ناتھ کا چہرہ اُتر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا" بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ڈاکوؤں کے انتقام کا نشانہ بنیں گے، آپ ایسے لوگوں کو حوصلہ دیں کہ حکومت ہر حال میں اُن کی حفاظت کرے گی اور کسی کا بال بیکا نہیں ہوگا۔" پھر وہ عبدالکریم کی طرف متوجہ ہوا۔

"میاں صاحب آپ کا بکس کھل جائے گا، یا تالہ توڑنا پڑے گا؟"

"جی آپ حکم دیں ابھی کھل جاتے گا۔"

"اچھا تو تکلیف کیجئے۔"

عبدالکریم نے اُٹھ کر بکس کا تالا کھولا اور ڈھکنا اُوپر اٹھا دیا۔

انسپکٹر نے یوسف کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے تھانے دار سے مخاطب ہو کر کہا" کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ حساب کتاب کا کام پنڈت دینا ناتھ کے سپرد کر دیا جائے۔"

"ہاں جی اِس کام کے لیے اُن سے بہتر اور کون ہوسکتا ہے۔" "آئیے سیٹھ جی آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ رقم گنیں آپ کے ہاتھ بھی میلے نہیں ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکے ابھی ابھی ٹکسال سے نکل کر آئے ہیں۔"

انسپکٹر نے پوچھا" میاں صاحب آپ کو اِتنا وزنی بکس یہاں منگوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔"

عبدالکریم نے کہا" جی پچھلی دفعہ میں نے زمین کا سودا کیا تھا تو فروخت کرنے والوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں نوٹوں کی بجائے چاندی کے روپے چاہئیں۔ میں نے گورداسپور کے بنک سے اُنھیں ایک ہزار نوٹوں کے بدلے سکے لے دیئے تو انہوں نے وزن دیکھ کر باقی

رقم سکوں میں لینا منظور کر لی۔ اِس دفعہ میں نے منشی کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ ایک ہزار روپے اور باقی رقم گورداسپور کے بنک کے نام ڈرافٹ کی صورت میں لے آئے۔ کسی نے مشورہ دیا تھا۔ کہ گاؤں میں اتنا ہی کیش لے کر آنا تھا، لیکن میرے منشی کو کسی ضروری کام کے لیے کہیں جانا پڑا اور میں اُسے ہدایات دے کر یہاں اپنے گاؤں میں آگیا تھا۔"

"تو آپ کے خیال میں ارجن سنگھ نے کہیں سے یہ سُن کر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ آپ رقم لے کر آنے والے ہیں۔"

"جی ہاں، لیکن یہ ایک معجزہ تھا کہ ارجن سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کا یہ وار خالی گیا اور میری عزت کے ساتھ میرا روپیہ بھی بچ گیا۔ ڈاکوؤں کی دوسری کوشش کی وجہ یہ تھی کہ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ میرا منشی گاڑی پر رقم لے کر آرہا ہے۔"

انسپکٹر نے دینا ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" لیکن جناب ڈاکوؤں کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ آپ کا منشی پیسے لے کر آرہا ہے؟"

دینا ناتھ کا چہرہ بھیگے ہوئے جوتے کی طرح ہو رہا تھا اور وہ اِدھر اُدھر ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے گلے پر چھری رکھی جا رہی ہے۔

عبدالکریم نے جواب دیا" جناب ایسی باتیں پوشیدہ نہیں رہتیں میرے لیے زمین بیچنے والے کو یہ یقین دلانا ضروری تھا کہ میرا منشی پیسے لے کر آرہا ہے اور وہ شام کی گاڑی پر پہنچ جائے گا اور اگلے دن ہم کچہری میں رجسٹری کروانے چلے جائیں گے۔ میں نے پنڈت دینا ناتھ سے بھی کہا تھا کہ وہ زمین کے مالک کو یقین دلائیں کہ میری طرف سے کوئی وعدہ خلافی نہیں ہوگی اور میں نے زیادہ احتیاط اس لیے بھی نہیں برتی تھی کہ منشی نقد صرف ایک ہزار روپیہ لے کر آرہا تھا۔ باقی رقم میرے نام گورداسپور بنک میں کیش ہونے والے ایک ڈرافٹ کی صورت میں تھی اور وہ اگر ڈاکو لے بھی جاتے تو میرا کچھ نہ بگڑتا۔ ویسے لوہے کا بکس اُٹھا کر کسی ڈاکو کے

لیے بارش اور کیچڑ میں بھاگنا آسان نہ تھا۔ یوسف صاحب نے میرے منشی کو حفاظت
سے پہنچانے کے کافی انتظامات کر رکھے تھے اور پولیس بھی بہت چوکس تھی۔
انسپکٹر نے کہا "پنڈت جی آپ پیسے گنتے جائیں تاکہ یہاں میرا کام جلدی
ختم ہو جائے۔ پہلے اس بکس میں سے وہ ڈرافٹ نکال کر دیکھ لیں۔ میاں صاحب
اس سلسلے میں آپ ان کی مدد کریں۔"

میاں عبدالکریم نے اٹھ کر بکس سے ایک چھوٹا سا چمڑے کا تھیلا نکالا۔
اسے اطمینان سے کھولا اور ڈرافٹ نکال کر انسپکٹر کو پیش کر دیا۔
دینا ناتھ جس کے ہاتھ لرز رہے تھے، اب ذرا اطمینان سے روپے گننے
لگا۔ بالآخر اس نے کہا۔

"جناب یہ پورا ایک ہزار روپیہ ہے۔"

انسپکٹر نے کہا "شکریہ سیٹھ صاحب اب آپ آرام سے کرسی پر بیٹھ جائیں اگر
آپ تھک گئے ہیں تو گھر جا کر آرام کریں۔"

تھانیدار نے کہا "ہاں جی میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ بہت تھک گئے ہیں۔"

انسپکٹر بیلا سنگھ کی طرف متوجہ ہوا

"سردار بیلا سنگھ حکومت آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے۔ ممکن ہے
کہ ایس پی صاحب آپ کو اچانک بلا لیں۔ تھانیدار صاحب آپ اپنی تفتیش جاری
رکھیں۔ ایسے مقدمات میں وعدہ معاف گواہوں سے بہت کچھ معلوم ہو جایا کرتا ہے۔
ممکن ہے کہ جو پھندا الگ چکا ہے اس میں اور بھی کئی ڈاکو پھنس جائیں۔ میں ایک
ضروری کام سے واپس جا رہا ہوں، لیکن میں آپ سے نئی اطلاعات پوچھتا رہوں گا۔"

انسپکٹر نے اٹھ کر اپنی موٹر سائیکل کا رخ کرتے ہوئے پریم سنگھ کو اشارہ
کیا۔ وہ بھاگ کر تیزی سے آگے بڑھا۔"

انسپکٹر نے اطمینان سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
پریم سنگھ تمہارے اور بہادر سنگھ کے متعلق مسٹر یوسف نے بہت اچھی باتیں
کہی ہیں۔ امید ہے کہ تم بہت جلد کوئی اچھی خبر سنو گے۔

انسپکٹر کے روانہ ہوتے ہی تھانیدار نے کہا "بھئی سیٹھ دینا ناتھ بہت تھک گئے
ہیں۔ تم ان کی گھوڑی لے آؤ اور انہیں عزت کے ساتھ رخصت کرو۔

اور گھوڑی لانے والے سپاہی نے سیٹھ جی کی عزت افزائی یوں کی کہ گھوڑی حوالات
کے بالکل قریب کھڑی کر دی۔ یہاں ڈاکو سلاخوں سے منہ لگائے اسے غضبناک نگاہوں سے
دیکھ رہے تھے۔

حوالدار اور بہادر سنگھ نے دینا ناتھ کے بھاری بھرکم وجود کو سہارا دے کر اٹھایا اور
اسے کشاں کشاں گھوڑی کے قریب لے گئے۔ جب دینا ناتھ گھوڑی پر سوار ہونے لگا تو
حوالاتیوں نے بلند آواز میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ سب سے بلند آواز دوسری واردات میں
پکڑے جانے والے اس آدمی کی تھی جسے سردار بیلا سنگھ کے کتوں نے پکڑ کر اس کی پنڈلی
کا کچھ گوشت بھی نوچ لیا تھا اور جسے صبح سویرے پیٹ پر ٹیکہ لگایا گیا تھا اور ڈاکٹر نے جو
گورداسپور سے ٹیکہ لگانے آیا تھا۔ یہ کہا تھا کہ ایسے چودہ ٹیکے لگیں گے۔

ایک سپاہی دینا ناتھ کی گھوڑی کی باگ پکڑ کر سڑک پر لے گیا لیکن حوالات سے
بدستور گالیوں کی آواز آتی رہی۔ دینا ناتھ کے ہونٹ لٹکے ہوئے تھے۔ گردن جھکی ہوئی
تھی اور وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا بھگوان یہ کیا ہوا؟ —— کیوں ہوا؟ —— بھگوان
میری مدد کر —— میں بہت دان کروں گا۔ میں کبھی تھانے کا رخ نہیں کروں گا۔ میں
کسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دوں گا۔ دینا ناتھ اپنے گرد و پیش سے بے خبر بڑبڑاتا
چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ وہ بازار اور نہر کے پل سے گزر چکا ہے۔ کئی لوگوں نے
راستے میں اسے سلام کیا لیکن سیٹھ جی نے کسی کی طرف توجہ نہ دی۔ اسے ایک انجانے خوف

سے پسینہ آرہا تھا۔ گھوڑی ریلوے سٹیشن کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اُس جگہ سے کچھ آگے دائیں طرف مڑی جہاں پلیٹ فارم ختم ہو چکا تھا اور ریلوے لائن عبور کرنے کے بعد جب وہ کھمبے کے قریب سے گزر رہا تھا، تو اچانک تین آدمی سامنے آگئے۔ گھوڑی اپنا راستہ بند پا کر اچانک کھمبے کی طرف ہٹ گئی اور اطمینان سے کھمبے اور اسے سہارا دینے والی تار کے درمیان سے گزر گئی۔

دیناناتھ کو اب اپنے گردوپیش کا ہوش نہ تھا۔ اُس نے سامنے کے آنے والوں کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا اور نہ ہی اُس تار کا کوئی نوٹس لیا تھا جو کھمبے سے کوئی چھ سات قدم دُور ایک کھونٹے کے ساتھ بندھی تھی۔ سیٹھ جی کی عافیت پسند گھوڑی نے اپنے لیے نئی گزرگاہ دیکھ لی تھی لیکن جب گھوڑی کی گردن آگے نکل گئی تو تار سیدھی سیٹھ جی کی ٹھوڑی کو لگی۔ وہاں سے پھسلی تو اُوپر کے چار دانت نکالنے کے بعد ناک کو بُری طرح زخمی کر گئی۔ سیٹھ جی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ ایک طرف لڑھک گئے۔

دیہاتیوں نے بھاگ کر پنڈت جی کو سہارا دیا لیکن وہ بے ہوش ہو چکے تھے اور منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک آدمی نے ہمت کی، وہ گھوڑی کے پیچھے بیٹھ گیا اور دوسرے نے لگام پکڑ لی۔ گھوڑی اپنی سست رفتاری کے باعث بہت مشہور تھی لیکن اب اُسے بھوک لگی ہوئی تھی۔ اور وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

سیٹھ جی گھر پہنچے تو وہاں کہرام مچ گیا۔ انھیں گھوڑی سے اتار کر بستر پر لٹا دیا گیا۔ اُن کا منہ اس قدر سوجا ہوا تھا کہ شکل بھی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ پہلے اُن پر دیسی ٹوٹکے آزمائے گئے اور جب انھیں کچھ ہوش آیا تو اُنھوں نے پُوچھا میں کہاں ہوں؟"

گھر والی سے جواب ملا" مہاراج اپنے گھر میں۔"

"میں زندہ ہوں؟"

مہاراج بھگوان کی کرپا سے آپ زندہ ہیں"۔

"اوہ مرگیا ـــــ مرگیا، مجھ پر کس نے حملہ کیا تھا؟"

اُن کے بیٹے روپ چند نے جواب دیا" پتا جی دوسرے گاؤں کے، وہ آدمی جو آپ کو لے کر آئے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ آپ کھمبے کے قریب سے گزرتے ہوئے تار سے زخمی ہو گئے تھے۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں آپ کو یہاں لائے تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے وہ پتا جی، میں نے انھیں دو دو روپے انعام دیے تھے"۔

دیناناتھ نے درد سے کراہتے ہوئے کہا" اُن کو گولی مارو، وہ مجھے پاس ہی ہسپتال کیوں نہ لے گئے"۔

تھوڑی دیر بعد پنڈت جی کو گڈے پر لاد کر ہسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ہسپتال پہنچتے ہی تین بار بے ہوش ہو چکے تھے۔

شام تک یہ قصّہ آس پاس کے تمام دیہات میں مشہور ہو چکا تھا۔

پڑوس کے گاؤں کا ایک سِکھ جیون سنگھ جسے دیناناتھ کے ساتھ خدا واسطے کا بیر تھا ہر محفل میں اس واقعہ کی یہ تشہیر کرتا تھا کہ دیناناتھ اتنا بدمعاش اور مغرور ہے کہ جب لوہے کی تار سامنے آگئی تب بھی یہ اپنی گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھا رہا۔ اُس نے چار دانت نکلوا لیے۔ ناک زخمی کروا لیا لیکن اِس کی اکڑ میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اُس سے پوچھتا ہوں کہ "بیوقوف کے بچّے اگر تو سر جھکا لیتا تیرا یہ حشر تو نہ ہوتا۔ یہ بھی اِس کی خوش قسمتی تھی کہ تار اِس کی گردن کو نہیں لگی تھی، ورنہ دیناناتھ جی کا بولو رام ہو گیا ہوتا"۔

اگلا دن یوسف کے لیے بڑا اہم تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آٹھ بجے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

دس بجے کے قریب جب بارش ذرا تیز ہو چکی تھی۔ پریم سنگھ گھوڑا بھگاتا ہوا گاؤں پہنچا اور اُس نے یوسف کو اطلاع دی" جناب مبارک ہو۔ انسپکٹر عبدالعزیز کا فون آیا ہے کہ آج شام چار بجے ایس پی صاحب اور ڈپٹی کمشنر صاحب نے آپ کو ملاقات

کے لیے بلایا ہے۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا "مبارک کس بات کی سردار جی؟"

پریم سنگھ نے جواب دیا "جناب آپ کو خوشی ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے تھانے کا ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اُس کے لیے خوشی کا دن ہے۔ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے تھانے کے سپاہیوں سے لیکر افسروں تک کو بہت جلد ترقیاں مل جائیں گی۔ کسی علاقے میں ایک نیک بخت پیدا ہوتا ہے تو سب کا بھلا ہوتا ہے۔"

یوسف مسکرایا "حوالدار صاحب، آپ یہی سننا چاہتے ہیں کہ آپ اے ایس آئی کب بنیں گے؟"

پریم سنگھ مسکرایا "میرے لیے آپ کا مسکرا دینا ہی کافی ہے لیکن اگر آپ زبان سے کہہ دیں تو میں سمجھوں گا کہ میں اے ایس آئی ہو گیا ہوں۔"

"اچھا بھئی میں کہہ دیتا ہوں کہ تم جلد اے ایس آئی ہو جاؤ گے۔ اب آرام سے یہاں بیٹھ جاؤ اور بارش رُکنے کا انتظار کرو۔ آج تم کھانا یہیں کھاؤ گے۔"

پریم سنگھ نے کہا "میاں جی یہ بارش رُکنے والی معلوم نہیں ہوتی۔ میں کل سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بادل جب برسنا شروع کر دیں گے تو خوب برسیں گے اور مجھے تھانیدار کا یہ حکم ہے کہ میں پیغام دے کر فوراً واپس پہنچوں تاکہ وہ انسپکٹر صاحب کو اطلاع دے سکیں کہ آپ ان کے پاس جا رہے ہیں۔ دیکھئے بارش اب آہستہ آہستہ تیز ہو رہی ہے۔ آپ دو بجے کے قریب تھانے پہنچ جائیں۔ ہم وہاں سے آپ کو لاری پر رخصت کریں گے۔ بہادر سنگھ خاص طور پر یہ کہتا تھا کہ آپ ذرا پہلے آئیں۔"

"اگر بارش کی یہی حالت رہی تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے لاری کی بجائے گھوڑے پر یہاں سے گورداسپور پہنچ جانا چاہیئے اس لیے آپ انسپکٹر صاحب کو فون پر یہ اطلاع دے دیں کہ میں سیدھا ایس پی صاحب کے دفتر پہنچ کر انھیں تلاش کروں گا۔"

"جناب آپ کی ایس پی اور ڈی سی سے ملاقات ہے۔ آپ خیال رکھیں کہ آپ کے کپڑے بھیگے ہوئے نہیں ہوں گے۔"

یوسف نے کہا "ایس پی اور ڈی سی کو معلوم ہوگا کہ بارش پر میرا کوئی کنٹرول نہیں اور اگر میں بس پر جاؤں تو بھی بھیگ جاؤں گا۔"

"بہت اچھا جیسے آپ کی مرضی لیکن بہادر سنگھ کو بہت افسوس ہوگا۔ وہ آپ کو دینا ناتھ کے متعلق بہت کچھ سنانا چاہتا تھا۔"

"وہ دینا ناتھ کے پاس گیا تھا؟"

"جناب وہ دینا ناتھ کو ہسپتال میں تین بار دیکھ چکا ہے اور ہر مرتبہ اپنے ساتھ نئے لوگوں کو لے جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے تھانے کے لوگوں کو نہیں، علاقے کے لوگوں کو اور جب وہ اس کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتا ہے تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ کل شام وہ مجھے بھی لے گیا تھا۔ دینا ناتھ کی واقعی بُری حالت ہے۔ چہرے کی سوزش سے اُس کی آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ مشکل سے بولتا ہے۔ صبح بہادر سنگھ اُسے دیکھ کر آیا تھا تو اُس نے بتایا تھا کہ دینا ناتھ کو بولنے کی تکلیف سے بچانے کے لیے ڈاکٹر نے اُس کے منہ پر پٹی باندھ دی ہے۔ اُس کے دل میں ایک ہی پچھتاوا ہے کہ اُس نے سیٹھ دینا ناتھ کو تار میں پھنس کر دانت نکلواتے نہیں دیکھا۔"

یوسف نے کہا "بہادر سنگھ ایک سیدھا سا آدمی ہے۔"

"ہاں جی سیدھا تو بہت ہے۔ لیکن اُس نے ایک کمال کیا ہے کہ صبح ہوتے ہی کہیں سے فوٹوگرافر کو تلاش کر کے تین چار آدمیوں کے ساتھ وہاں لے گیا تھا اور انہوں نے دینا ناتھ کے تیمارداروں کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر اُسے بستر سمیت اُٹھوا کر باہر روشنی میں رکھ دیا تاکہ فوٹوگرافر اُس کی تصویریں لے سکے۔ دینا ناتھ کو خبر نہیں

تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بہادر سنگھ اُٹھا اُٹھا کر اُس کے پوز بناتا تھا اور جب ہسپتال کے ڈاکٹر اور نرسیں متوجہ ہوئے تو بہادر سنگھ بڑے اطمینان کے ساتھ اس کا بستر اندر رکھوا کر روانہ ہو چکا تھا۔

بیوقوفی تو دراصل دینا ناتھ کے بیٹے کی تھی۔ اُس نے تھانے میں یہ رپورٹ لکھوائی تھی کہ اُس کے پتا جی اِس لیے تار میں پھنس کر زخمی ہو گئے تھے کہ وہ غلط جگہ لگی ہوئی تھی اور انھیں یہ بھی شبہ ہے کہ اُن کی گھوڑی سیدھے راستے جا رہی تھی لیکن کسی دشمن نے ہانک کر اُس کا رُخ بدل دیا تھا۔

بہادر سنگھ نے اُس کھمبے اور تار کی تصویریں بھی بنوائی ہیں اور جو کچھ وہ رپورٹ میں بیان کرے گا، بہت دلچسپ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ گورداسپور سے واپس آئیں گے۔ بہادر سنگھ آپ کا انتظار کر رہا ہوگا۔"

باب - ۱۴

شام کے وقت یوسف کے مہمان خانے میں کافی چہل پہل تھی۔ اس کے والد شام کی گاڑی سے گھر پہنچ گئے تھے گاؤں کے سرکردہ اور آس پاس کے دوسرے لوگ بمعہ عبدالکریم، فضل دین پہلے ہی وہاں موجود تھے اور انہیں بہادرانہ کارناموں پر مبارک باد دی جا رہی تھی۔ سردار بیلا سنگھ اور بہادر سنگھ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ جیون سنگھ نمک مرچ لگا کر دینا ناتھ کے زخمی ہونے کا قصہ بیان کر رہا تھا۔

یوسف کے والد اور حویلی میں جمع ہونے والے دوسرے لوگوں کو یوسف کے آنے کا انتظار تھا۔ جوں جوں اندھیرا ہو رہا تھا اُن کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ بہادر سنگھ نے اُٹھ کر کہا "چچا جی میں تھانے جا کر فون کرواتا ہوں کہ وہ اب تک کیوں نہیں آتے"۔

یوسف کے والد نے کہا "بیٹا تھوڑی دیر اور انتظار کرو۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا"۔

اچانک بلّو نے کہا "جناب یوسف صاحب آ رہے ہیں" اور چند ثانیے بعد حویلی میں سکوت طاری تھا اور گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دے رہی تھی۔

دو منٹ بعد یوسف حویلی میں داخل ہو کر ہانپتے ہوتے گھوڑے سے اُترا۔ میاں عبدالرحیم اُسے پیار سے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے لیکن یوسف نے کہا۔

"اباجی میرے کپڑے کیچڑ سے بھرے ہوتے ہیں"۔

باپ نے اُسے گلے لگاکر بوسہ دیتے ہوئے کہا" ارے بیٹا مجھے اُس وقت بھی تم پر اسی طرح پیار آیا کرتا تھا۔ جب تم بہت چھوٹے تھے اور بھاگتے ہوئے گرکر مٹی میں لت پت ہو جایا کرتے تھے —— مجھے تمہارے کارنامے پر فخر ہے۔" یوسف سے یہ بات سننے کے لیے سب بے چین تھے کہ ایس پی اور ڈی سی سے اُس کی ملاقاتوں کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ بہادر سنگھ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے کہا" بھائی صاحب یہ تو بتایئے کہ گورداسپور میں کیا ہوا۔ آپ نے اِتنی دیر کیوں لگائی؟"

"بھئی میں پہلے انسپکٹر صاحب سے مِلا تھا۔ انہوں نے میرے لباس پر کیچڑ دیکھا تو نہلا دھلا کر اپنے نئے کپڑے پہنا دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارا قد برابر ہے۔ ورنہ میں کارٹون دکھائی دیتا۔ وہ مجھے ایس پی صاحب کے پاس لے گئے۔ ایس پی صاحب نے کچھ دیر دونوں وارداتوں کے متعلق باتیں کیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ پھر وہ چند آدمیوں کو ٹیلی فون کرنے کے بعد مجھے ڈی سی کے پاس لے گئے۔ جب میں انسپکٹر صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا تو پولیس اور محکمہ مال کے افسر بھی، ڈی سی کے گھر آئے ہوئے تھے۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ مجھے اِن دونوں ڈاکوؤں کے متعلق دوبارہ ان کے سوالات کے جوابات دینے پڑے اور وہاں کافی وقت لگ گیا اور ایک عجیب بات ہوئی۔ ڈی سی نے اچانک پوچھا" تمہاری حفاظت کے لیے تمہارے گاؤں سے یا پولیس اسٹیشن سے کتنے آدمی آئے ہیں؟" میں نے جواب دیا" جی میں اکیلا گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہوں۔" دوسرا سوال مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کوئی اسلحہ ہے؟" میں نے جواب دیا" میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں۔ خطرے کے وقت صرف اپنے گھوڑے پر بھروسہ کر سکتا تھا۔" ڈی سی نے چند منٹ ایس پی سے باتیں کیں اور وہیں یہ فیصلہ ہوا کہ میرے لیے اسی وقت ایک ریوالور کا انتظام کیا جائے۔

میری یہ بات ایس پی صاحب سے پہلے ہو چکی تھی کہ میں کوئی انعام کسی صورت میں نہیں لوں گا۔ اِس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ ایس پی صاحب نے اپنے ذاتی اسلحہ سے تحفہ کے طور پر ایک خوب صورت ریوالور منگوایا اور مجھ سے یہ کہا کہ میں آپ کو ذاتی طور پر یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں حکومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس بات کا خیال رکھو گے کہ مَیں یہاں سے تبدیل ہو کر جا رہا ہوں اور جب کسی دن تم میرے پاس کوئی تحفہ لے کر آؤ گے تو میں اُسے بخوشی قبول کروں گا۔ ڈی سی صاحب نے بھی مجھ سے پوچھا تھا کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن مَیں نے اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنے لئے سب کچھ میں خود کروں گا۔ اور اگر مَیں نے دوسروں کے لیے یا اس ملک کے لیے کوئی اچھا کام کیا تو بھی اُس کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ جب مَیں رخصت ہونے لگا تو ڈی سی صاحب نے کہا تھا کہ تم نے اپنی رپورٹ میں جو سفارشات کی ہیں، وہ سب منظور کر لی جائیں گی اور ایس پی صاحب نے بھی مجھے یہی کہا تھا۔ کہ جب تمہیں کوئی کام پڑے سیدھا ڈی سی کے پاس چلے آنا۔"

بہادر سنگھ نے پوچھا" جی میرے اور حوالدار کے متعلق بھی۔"

"ہاں بھئی امید ہے کہ تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔"

پریم سنگھ نے کہا" یار ذرا اپنا پستول تو دکھاؤ۔" یوسف نے ریوالور پیٹی سمیت اتار کر اس کو پیش کر دیا۔ اُس نے چراغ کی روشنی میں ریوالور نکال کر ایک ہی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔" یار بہت خوب صورت ہے، یقیناً بہت قیمتی ہوگا۔"

"بہادر سنگھ نے کہا" یار ایس پی کا ذاتی ریوالور کوئی کم قیمت کا تو نہیں ہو سکتا۔" یوسف نے کہا" حوالدار صاحب دو تین دن تک انسپکٹر صاحب میرے لیے بہت سی گولیاں لے کر آئیں گے تا کہ میں مشق کر سکوں۔ اُن کے ساتھ ایک نشانہ باز بھی

آئے گا۔ جو ایک دو دن میرا مہمان ہوگا۔ اور انسپکٹر صاحب شاید آپ کے لیے بھی کوئی اچھی چیز لے کر آئیں۔"

عبدالرحیم نے کہا۔ "اچھا بیٹا اب اندر جا کر کھانا کھالو۔"

یوسف نے پوچھا "اباجی آپ کھانا کھا چکے ہیں۔"

"ہاں بھئی میں نے نمازِ مغرب کے بعد میاں عبدالکریم کے ساتھ کھانا کھا لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری امّی اور دادی کے سوا گھر کے باقی سب لوگ کھا چکے ہیں یقیناً وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

پریم سنگھ نے پستول چمڑے کے غلاف میں بند کر کے پیٹی واپس دیتے ہوئے کہا: "یوسف جی پستول دینے والوں نے آپ کو یہ نہیں سمجھایا تھا کہ رات کو چلتے وقت اسے لوڈ کر کے رکھنا چاہیے۔"

یوسف نے جواب دیا۔ "رات کے وقت میری ساری توجہ اپنے راستے پر تھی۔ اور اگر کوئی اچانک نظر آ جاتا تو میرے لیے راستہ بدل کر نکل جانا آسان ہوتا۔ میں بلا وجہ آج نشانہ بازی کے موڈ میں بھی نہیں تھا ——"

آپ نے کھانا کھا لیا ہے۔؟

"جی ہاں، ہم سب کھا چکے ہیں۔ آپ جائیں۔"

یوسف نوکر کو گھوڑے کے متعلق ہدایات دے کر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا گھر پہنچا۔ اس کی ماں حسبِ معمول ڈیوڑھی کے دروازے پر موجود تھی اور اس مرتبہ اس کے دائیں بائیں امینہ اور اُس کی ماں بھی کھڑی تھی۔

یوسف نے حسبِ معمول سلام کہہ کر ماں کے سامنے سر جھکا دیا اور وہ اُس کی پیشانی چومنے لگی۔

رشیدہ نے کہا:

"بہن یوسف کی بہت بڑی کامیابی مبارک ہو۔"

امینہ بولی "چچی جان میں بھی آپ کو مبارک باد دیتی ہوں اور یوسف صاحب آپ کو بھی۔"

"شکریہ، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کیا کامیابی ہوئی ہے۔"

رشیدہ نے کہا "بیٹا خدا کا شکر ادا کرو۔ ایس پی اور ڈی سی کا آپ کو اتنی عزت سے بلانا کوئی معمولی بات نہیں۔"

"جی یہ ایک رسمی سی بات تھی۔"

"لیکن تمہارے چچا تو کہتے تھے کہ اس ملاقات کے بعد تمہارے لیے کامیابی کے دروازے کھل جائیں گے۔"

"جی یہ ایک معمولی سی بات تھی —— امّی جان مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"چلو بیٹا۔ تمہارا کھانا ابھی تیار ہو جائے گا۔ میں نے تمہارے لیے صاف کپڑے غسل خانے میں رکھوا دیے ہیں۔ تم نہا لو اتنی دیر میں تمہارا کھانا گرم ہو جائے گا۔"

——— o ———

یوسف نے کھانے کے بعد نماز پڑھی تو اُس کے باپ نے اُوپر سے آواز دی:

"بیٹا یہاں آ جاؤ میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

یوسف جلدی سے اُوپر پہنچا اور ایک کرسی اُٹھا کر کھلی چھت پر باپ کے قریب بیٹھ گیا۔ باپ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"یوسف مجھے سچ سچ بتاؤ کہ ڈی سی اور ایس پی نے صرف تمہارے پستول کا ذکر کیا تھا یا تمہارے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی باتیں کی تھیں؟"

"جی میرے مستقبل کے متعلق وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے کہ آگے چل کر اگر تمہیں کسی ملازمت کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک میرے پاس چلے آنا۔ ایس پی صاحب

نے تو یہاں تک کہا کہ تم بی اے کرتے ہی میرے پاس آؤ اور میں پولیس سروس کے لیے تمہاری مدد کروں گا۔ ڈی سی صاحب نے کہا تھا تمہیں سول یا فوجی سروس میں ہماری ضرورت پڑی تو تمہاری پوری مدد کی جائے گی۔"

"اور تم نے کیا جواب دیا تھا؟"

"جی میں نے یہی کہا تھا کہ میں بی اے یا ایم اے کرنے کے بعد اپنے مستقبل کا فیصلہ کروں گا۔"

"برخوردار جو پروگرام تمہارے ذہن میں ہے۔ وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے دماغ پر اب تک رائٹر بننے کا بھوت سوار ہے۔ میرا خیال تھا کہ کالج کے نئے ماحول میں تمہارے خیالات بدل جائیں گے۔ وہاں تمہارے پروفیسر تمہیں یہ سمجھا سکیں گے کہ ہمارے ملک میں کوئی رائٹر ایسا نہیں جس نے عزت اور فراغت کی روزی کمائی ہو لیکن تمہارے خیالات میں شاید کوئی فرق نہیں آیا۔ اب تمہیں ایک زریں موقع ملا تھا اور تم نے یہ کہہ دیا کہ آگے چل کر سوچوں گا۔ جیسے وہ لوگ اس بات کا انتظار کرتے رہیں گے کہ تم اچھی طرح سوچ لو اور پھر وہ تمہیں تمہاری پسند کی ملازمت دلوا دیں گے۔"

یوسف نے کہا "اباجی میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

"نہیں پہلے میرے سوال کا جواب دو کہ تم زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"اباجی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"باپ نے غصے سے پوچھا "تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"اباجان اس وقت میں آپ سے صرف ایک وعدہ کر سکتا ہوں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو کچھ میں کروں گا آپ اس پر فخر کیا کریں گے اور میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ کو ندامت ہو۔"

"دیکھو یوسف ایسی باتیں تمہاری ماں کو خوش کر سکتی ہیں۔ مجھے نہیں۔ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں۔"

یوسف نے جواب دیا "اباجی آپ مطمئن رہیں۔ میں بھی پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا ہوں۔"

قدسیہ بیگم دودھ کا ایک جگ لے کر اوپر آئیں اور ایک گلاس بھر کر یوسف کے والد کو پیش کرتے ہوئے کہا "لیجئے دودھ پیجئے اور میرے بیٹے کو پریشان نہ کیجئے۔ آپ کو دنیا میں اس کی وجہ سے کسی جگہ شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

عبدالرحیم نے کچھ کہے بغیر گلاس پکڑ لیا اور ماں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے یوسف کی طرف متوجہ ہو کر کہا "بیٹا تم نے اپنے اباجی کو بہت پریشان کیا۔ اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی تمہیں۔ عبدالکریم کی بیٹی کہتی ہے کہ ہمیں کچھ بانٹنا چاہیے۔ امینہ کی ماں بھی بہت خوش تھی۔"

"امی جان مجھے اُن کی خوشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے ملاقات کے لیے بلایا تھا اور میں ان سے مل کر آیا ہوں۔ کچھ باتیں عبدالکریم صاحب سے بھی تعلق رکھتی ہیں وہ صبح بتا دوں گا۔"

عبدالرحیم نے پوچھا "عبدالکریم سے کون سی باتیں تعلق رکھتی ہیں؟"

"جناب ایک تو یہ ہے کہ انھیں فضل دین اور اپنے ایک مزارع کو بندوقیں خرید کر دینی پڑیں گی۔ انھیں لائسنس مل جائے گا۔ ہمارے گاؤں سے تلو اور بوٹا عیسائی اور پیراں دتہ چوکیدار کو بھی بندوق کے لائسنس مل جائیں گے اور سرکاری اسلحہ خانے سے بہت سستی قیمت پر بندوقیں نکلوا دی جائیں گی۔ گاؤں کے لوگ بخوشی ان کے لیے چندہ جمع کر دیں گے۔"

عبدالرحیم نے کہا "بیٹا میں لاہور تبدیل ہو گیا ہوں اور مجھے پندرہ دن کی چھٹی

ملی ہے اور تم اِن دس دنوں میں اتنا کچھ کر چکے ہو کہ اُسے جلد سمیٹنے کی صورت نظر نہیں
آتی۔ مَیں نے لاہور میں مکان لے لیا ہے اور چپڑاسی کو چھوڑ آیا ہوں اور پرسوں وہ بیار
آجائے گا اور دو دن بعد تمہیں بھی اُس کے ساتھ لاہور چلے جانا چاہیے تاکہ کالج کھلنے
سے پہلے کچھ تیاری کر لو۔"

قدسیہ نے کہا۔ "آپ اپنے بیٹے کو کوئی خوشی کی بات بھی بتا دیا کریں۔"

"بیٹا خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ہم لاہور میں اکٹھے رہا کریں گے۔"

یوسف نے کہا " اباجی یہ بات تو مجھے آتے ہی معلوم ہو جانی چاہیے تھی۔"

باپ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا " بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سُن کر
خوش ہو گئے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جب تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ ہم سب لاہور جا
رہے ہیں تو تم مجھے اپنی ملاقات کے متعلق تمام باتیں بتانا [illegible]ل جاؤ گے۔ اب تمہاری ماں
کی موجودگی میں بھی میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تمہاری باتوں سے خوش نہیں ہوں۔
تمہیں ایک سنہری موقع ملا تھا لیکن تم نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔"

" اباجی مَیں نے وہی کیا ہے جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ جب میں گیا تھا تو وہ
سب مجھ سے اُٹھ کر ملے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جب میں اُن سے رخصت ہونے
لگوں تو میرا قد وقامت اُن کی نگاہوں میں چھوٹا ہو جائے۔"

" سچ کہو تم نے اُنھیں بھی یہ بتا دیا تھا کہ تم ناول لکھنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ اِس
لیے اور کچھ نہیں کرو گے۔"

قدسیہ نے فوراً مداخلت کی ضرورت محسوس کی اور کہا " اب بلاوجہ اپنا موڈ
مت خراب کیجئے۔ اگر یوسف نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو آتے ہی بتا دیتا۔ اِس نے
اپنی تعلیم کے بارے میں آپ سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب پورے کیے ہیں اور
تعلیم کے بعد میرا بیٹا جس کام میں ہاتھ ڈالے گا اُس میں کامیاب ہو گا۔ آپ اس کے لیے

دعا کیا کریں ——— میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ رشیدہ اور اس کی بیٹی بہت
اصرار کرتی ہیں کہ ہم پرسوں یا اس سے اگلے روز اُن کے ہاں کھانا کھائیں۔ انہوں نے ہمارے
علاوہ آپ کے بھائیوں اور اُن کے بیوی بچّوں کو بھی بلایا ہے۔"

یوسف نے کہا " امی جان آپ نے اُنھیں یہ نہیں بتایا کہ ہم لاہور جانے کی
تیاری کر رہے ہیں۔"

"بیٹا میں نے انھیں بتایا تھا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں اور انھوں نے ایک اور درخواست
کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ایک روز پہلے روانہ ہوں اور ایک رات امرتسر میں اُن کے
ہاں قیام کریں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ امرتسر میں آپ کی دعوت پھر کبھی کھا لیں گے۔ ابھی تو مجھے
یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں یوسف اور اُس کے اباجان کی مصروفیات کیا ہوں گی۔"

عبدالرحیم نے کہا "عبدالکریم نے تو مجھے دیکھتے ہی دعوت کھانے کا وعدہ لے لیا تھا
اور وہ کئی بار کہہ چکا ہے کہ جب میں امرتسر سے گزروں اُن کے ہاں ضرور ٹھہرا کروں۔ وہ خواہ کہیں
ہوں مکان پر نوکر میری خدمت کے لیے موجود ہوں گے۔ انہوں نے لاہور میں بھی مکان
کے لیے کافی زمین خریدی ہوئی ہے اور جب مکان مکمل ہو جائے گا تو وہ لاہور میں
منتقل ہو جائیں گے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں لاہور تبدیل ہو کر جا رہا ہوں تو بہت
خوش ہوا تھا۔ آدمی تو بہت سادہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن جائیداد بہت بنائی ہے اُس
نے۔ کئی جگہ ٹھیکے لے رکھے تھے۔ دو مربع ایک کوٹھی لائل پور میں ہے اور اب یہاں
بہت سی زمین خریدنا چاہتا ہے۔"

نیچے سے یوسف کی دادی کی آواز سنائی دی "یوسف تم کہاں ہو؟"

یوسف اُٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اُترا اور دادی کو فرش سے تین چار سیڑھیاں اُوپر
روکتے ہوئے بولا "دادی جان میں نے سلام کہا تھا لیکن آپ نماز پڑھ رہی تھیں۔"

"عبدالرحیم سو گیا ہے؟"

یوسف نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا" دادی جان آپ آرام سے میری بات سُنیں۔ آپ اِس وقت اُوپر جا کر جو موضوع چھیڑنا چاہتی ہیں۔ اس سے بہت بد مزگی پیدا ہو گی۔"

"نالائق میں کون سا موضوع چھیڑنا چاہتی ہوں۔"

"دادی جان خدا کے لیے آہستہ بولیے۔ ابّا جان آپ کی آواز سنیں گے تو آپ کو اُوپر بلا لیں گے اور پھر وہ تماشہ شروع ہو جائے گا —— میرے ساتھ آیئے ہم چچی جان کے گھر میں آرام سے باتیں کریں گے۔"

دادی کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن یوسف اُسے ہاتھ سے پکڑے برابر کے مکان کے صحن میں لے گیا۔

چچی نے پوچھا" کیا ہوا بیٹا دادی کو اِس طرح کیوں لیے پھرتے ہو؟"

"چچی جی خدا کیلئے انھیں منع کریں یہ آدھی رات کے وقت تماشہ شروع کروانا چاہتی ہیں۔"

دادی نے یوسف کو کان سے پکڑ کر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف کیا بکتے ہو؟"

"چچی جان خدا کے لیے دادی جان کو سمجھائیے، ابّا جی تھکے ہوئے ہیں انھیں نیند بھی آ رہی ہے اور غصّہ بھی۔ دادی جان اُوپر جا کر وہی پرانا مسئلہ چھیڑنا چاہتی ہیں۔ پہلے تو آپ سب اِس پر ہنسا کرتے تھے لیکن آج دادی جان کچھ زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ جب میں کچھ کہوں گا تو ابّا جان آپے سے باہر ہو جائیں گے۔"

دادی نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا" مکار کہیں کا۔ شرم نہیں آتی۔ بے وقوف میں اُس دن ہی سمجھ گئی تھی جب تم سر ہتھیلی پر رکھ کر ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔"

چچی نے ہنستے ہوئے کہا" دادی آپ کیا سمجھ گئی تھیں۔"

"بکو مت۔ یہ تم سب جانتے ہو اور اس کی ماں بھی جانتی ہے کہ یہ لڑکا رشیدہ کی لڑکی کے سوا کسی کو پسند نہیں کرے گا۔"

یوسف نے جلدی سے دادی کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" دادی خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔"

"بے وقوف یہ کوئی انوکھی بات ہے۔ کوئی یہ تو نہیں کہے گا کہ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کے ہم پلّہ نہیں تھے۔"

"دادی جان جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ آپ کو میرے لیے لڑکیاں پسند کرنے اور لڑکیوں کے لیے مجھے پسند کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہا۔ اگر امی جان مداخلت نہ کرتیں تو خدا جانے کتنی بار میری منگنی ہو چکی ہوتی۔"

"بے وقوف اِس دفعہ وہ مخالفت نہیں کرے گی۔ وہ دِل سے خوش ہے"

یوسف نے اپنا منہ دادی کے کان کے قریب لے جا کر کہا" دادی جان اگر سارا زمانہ خوش ہو جائے تو بھی میں خوش نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے زندگی میں کوئی کام کرنے دیجئے۔ آپ اگر مجھے ابّا جی سے گالیاں دلوانا چاہتی ہیں اور گھر آئے مہمانوں کی بے عزتی بھی کروانا چاہتی ہیں تو آپ اپنا شوق پورا کر لیجئے۔ وہ آپ کی مبارک تجویز سنتے ہی مجھے بلا لیں گے۔ اِس کے بعد آپ میرا انکار اور ان کی گالیاں سنیں گی۔ شاید وہ دو چار تھپڑ مارنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ لیکن وہ بات نہیں ہو گی۔ آپ کو میری منگنی کے لیے کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ چچی جان آپ بھی جائیں دادی جان کے ساتھ، گالیاں سُن لیں اور پھر مہمانوں کو بھی بلا لیں تاکہ انھیں یہ گِلہ نہ رہے کہ دادی جان نے اُن کا مقدمہ پُوری طرح نہیں لڑا۔"

دادی نے تلملا کر کہا" میں لعنت بھیجتی ہوں اُن سب پر میں تمہارے ایک بال کے بدلے ان سب کو قربان کر سکتی ہوں۔ اگر تمہاری مرضی نہیں تھی تو تم نے مجھے پہلے کہہ

دیا ہوتا۔"

یوسف نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا" دادی جان میری مرضی ہوگی تو سب سے پہلے آپ کو ہی کہوں گا۔" دادی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔"بیٹا خدا سے ہر اچھی چیز میں تمھارے لیے مانگا کرتی ہوں اور میں یہ دُعا کرتی ہوں جو لڑکی تمھیں پسند آئے اُس جیسا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ یہ امینہ جیسی لڑکیاں اُس کے قریب کھڑی ہوں تو لوگ کہیں کہ یہ اُس لڑکی کی نوکرانی ہے۔ میں تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ تم اس لڑکی کو پسند کر چکے ہو۔"

"دادی جان آپ سونے سے پہلے میرے لیے دعا کریں گی نا۔"

"کیوں نہیں کروں گی۔ تمھارے لیے دعا کیے بغیر مجھے نیند کیسے آسکتی ہے۔"

"چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

"جاؤ زیادہ خوشامد نہ کرو۔ میں اپنا راستہ دیکھ سکتی ہوں۔" دادی نے روکھے پن سے کہا اور اُٹھ کر دوسرے مکان میں چلی گئی۔

یوسف کی چچی نے کہا" خدایا تیرا شکر ہے ورنہ میں تو محسوس کر رہی تھی کہ آج کوئی آندھی آرہی ہے۔ یوسف تم بہت خوش قسمت ہو، اتنا کچھ کہہ جاتے ہو لیکن دادی بُرا نہیں مانتیں۔"

"چچی جان بات یہ ہے کہ دادی جان ہی بہت اچھی ہیں۔"

صبح یوسف کے گھر سے رخصت ہوتے وقت عبدالکریم نے کہا۔

"میاں جی میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ آپ کے سارے گاؤں کے لوگوں کی دعوت کا انتظام کروں۔ میرے گاؤں کی تھوڑی سی آبادی ہے۔ انھیں بھی بلا لیا جائے گا۔ مسلمانوں کے لیے تو کھانا پکانے والے نائی کا انتظام ہو جائے گا۔ لیکن دوسروں کے لیے ہمیں سکھ یا ہندو باورچی کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

عبدالرحیم نے کہا "یار بلا وجہ کیوں ان الجھنوں میں پڑتے ہو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اس دعوت کو زیادہ سے زیادہ بیس افراد تک محدود کر دو۔ اس میں ہمارے گھر کے چیدہ چیدہ افراد آجائیں گے۔ اگر زیادہ تکلیف کرنا چاہتے ہو تو ڈاکوؤں سے بچ جانے کی خوشی میں مٹھائی بانٹ دینا یہ بہتر ہوگا کہ مٹھائی دعوت سے پہلے تقسیم کر دی جائے۔"

"میاں جی کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ مٹھائی کی ایک ٹوکری میں تھانے میں بھی بھیج دوں؟"

"میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میاں صاحب لیکن آپ کے خاندان کے تمام مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے دعوت میں شریک ہونے چاہئیں۔ میرے پاس پچاس آدمیوں کا انتظام ضرور ہوگا۔"

تیسرے دن یوسف باہر کی حویلی کی ایک دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے تختے پر پستول کے نشانے کی مشق کر رہا تھا اور اس کا والد، انسپکٹر عبدالعزیز اور پولیس کا ماہر نشانہ باز جسے عبدالعزیز ساتھ لے کر آیا تھا تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے جب اس نے یکے بعد دیگرے چند گولیاں نشانے پر لگائیں تو نشانہ باز نے کہا" یوسف صاحب آپ نے انسپکٹر صاحب کو یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ آپ اس کام میں بھی ماہر ہیں۔"

یوسف نے جواب دیا" معاف کیجئے آج شروع کرنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ پرسوں جتنی گولیاں میں اس پستول کے ساتھ لایا تھا انھیں استعمال کر کے مجھے کافی مشق ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ میں کبھی کبھی ابا جی کا ریوالور چلا کر بھی دیکھا کرتا ہوں۔ ریوالور اور بندوق چلانے سے پہلے میں نے ہوائی بندوق کے ساتھ بہت مشق کی جو ابا جی نے مجھے ساتویں جماعت میں لا کر دی تھی۔"

عبدالعزیز نے یوسف سے پوچھا" یوسف اب تمھاری چھٹیاں کتنی رہ گئی ہیں۔"

"جی میری چھٹیاں کوتی پندرہ دن تک ختم ہو جائیں گی لیکن اباجی کی تبدیلی لاہور ہو چکی ہے۔ اِس لیے مجھے چند دن پہلے ہی یہاں سے جانا پڑے گا۔"

میاں عبدالرحیم نے کہا "انسپکٹر صاحب اگر اسے یہاں کوئی کام ہو تو میں اپنی رخصت میں دو چار دن کا اضافہ کروا سکتا ہوں۔"

"میاں صاحب کوئی خاص کام نہیں۔ میرے دل میں خیال آیا تھا کہ یوسف جیسے نوجوان کو ہر وہ کام آنا چاہیے جس کا بیسویں صدی کے نوجوانوں کے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ یوسف کو موٹر چلانا بھی سیکھ لینا چاہیے۔ اگر یہ چند دن میرے پاس آجایا کرے تو اس کے لیے کار اور ڈرائیور کا انتظام ہو سکتا ہے۔ آپ کو اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ میرے پاس کار کہاں سے آگئی۔ وہ میری بیوی کو جہیز میں ملی تھی جس کا اس کے سوا کوئی مصرف نہیں کہ کوئی ڈرائیونگ سیکھنا چاہے تو میں اسے دے دیا کروں، مجھے ڈرائیور کو بھی تنخواہ نہیں دینا پڑتی۔ وہ میرے سسر کا پرانا ملازم ہے اور تنخواہ بھی وہیں سے حاصل کرتا ہے۔"

فضل دین حویلی میں داخل ہوا۔ اور ایک ہی نظر میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یوسف اور اُس کے والد کھانے کے متعلق بھول چکے ہیں۔ بلّو نے اسے دیکھ لیا اور آگے بڑھ کر پوچھا "کیوں فضل دین خیر تو ہے؟"

فضل دین نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا "انسپکٹر صاحب کب آئے ہیں؟"

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے وہ آتے ہی یوسف صاحب کی نشانہ بازی دیکھنے لگ گئے تھے۔ تمہیں معلوم ہے۔ کہ مجھے بندوق ملنے والی ہے اور یوسف صاحب کہتے تھے کہ اگر میاں عبدالکریم تمہاری مدد کرنے پر تیار ہو گئے تو تمہیں اور بریال سنگھ کو بندوق کا لائسنس مل جائے گا۔"

"انسپکٹر کب تک یہاں ٹھہریں گے؟"

"معلوم نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جلدی چلے جائیں گے۔"

فضل دین نے کہا "سنو بلّو اگر ایک کام کرو تو ہمارے ٹھیکے دار صاحب تم پر بہت خوش ہوں گے اور انعام بھی دیں گے۔"

"یار کام تو سناؤ۔"

فضل دین نے کہا "دیکھو بلّو تم بہت تیز بھاگتے ہو۔ تم فوراً ہمارے گھر پہنچ کر میاں صاحب کو اطلاع دو کہ انسپکٹر صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں اگر وہ اسی وقت یہاں آجائیں تو انھیں دعوت میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ جھوٹ موٹ تو کوئی پیغام میں بھی دے دوں گا لیکن شاید وہ مانیں یا نہ مانیں۔

دیکھو بلّو جلدی کرو۔ میاں صاحب تمہیں انعام دیں گے۔"

بلّو وہاں سے کچھ کہے بغیر بھاگ نکلا۔

حویلی میں جمع ہونے والے بڑے انہماک سے نشانہ بازی دیکھ رہے تھے۔ یوسف کے انسٹرکٹر کے علاوہ انسپکٹر عبدالعزیز اور یوسف کے والد نے بھی باری باری چند فائر کیے اور اختتام پر انسپکٹر نے یوسف سے کہا "میرا خیال ہے اب بارود ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ اس امتحان میں پاس ہو گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ڈرائیونگ سیکھنے میں بھی آپ کو دیر نہیں لگے گی۔ یہاں آس پاس کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی ورنہ اپنی کار میں یہاں بھیج دیتا۔ اب دو چار دن کے لیے تمہیں گورداسپور آنا پڑے گا۔"

عبدالکریم ہانپتا ہوا حویلی میں داخل ہوا اور اُس نے آگے بڑھ کر انسپکٹر سے مصافحہ کرنے کے بعد یوسف سے شکایت کے لہجے میں کہا "دیکھئے آپ نے مجھے اطلاع ہی نہیں دی کہ انسپکٹر صاحب یہاں تشریف لائے ہوتے ہیں۔"

یوسف کے والد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یار پریشانی کی کوئی بات نہیں جو بات آپ کہنا چاہتے تھے وہ اب بھی کہی جا سکتی ہے۔"

انسپکٹر نے پوچھا "کیا بات ہے عبدالکریم صاحب ہم نے آپ کے دو آدمیوں کے لیے اسلحہ کے لائسنس حاصل کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ ایک فضل دین ہے اور دوسرا ہردیال سنگھ۔ آپ کے گھر کی حفاظت کے لیے کسی اور کو اسلحہ کی ضرورت ہو تو ڈپٹی صاحب اس کے لیے بھی منظوری دے دیں گے۔"

"صاحب بہت شکریہ، یوسف نے بتایا تھا کہ اسلحہ ملنے کی صورت میں۔ ان کے لیے اسلحہ خریدنے کا مسئلہ ہوگا۔ میں نے اس وقت کہہ دیا تھا کہ میں پوری قیمت ادا کردوں گا۔ لیکن اس وقت ایک اور درخواست لے کر آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ میرے گھر کھانا کھائیں۔"

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ "اگر میں نے ٹھہرنا ہوتا تو آتے ہی یوسف کو کہہ دیتا کہ کھانا کھا کر جاؤں گا لیکن مجھے ذرا جلدی ہے۔"

عبدالکریم نے کہا۔ "جناب کھانے کا وقت تو ہونے والا ہے اور کھانا تیار ہے۔ یوسف کے خاندان کے سب لوگ وہاں تشریف لائیں گے۔ اگر آپ دعوت میں شریک ہو جائیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

عبدالرحیم نے کہا "یہ دعوت اِس خوشی میں ہو رہی ہے کہ ٹھیکیدار صاحب کو ایک مصیبت سے نجات ملی ہے۔ ارجن سنگھ ڈاکو کا پکڑے جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر کوئی خاص بات مانع نہ ہو تو آپ اِن کی دعوت ضرور قبول کریں۔"

یوسف نے کہا "یہ دونوں گاؤں میں آج مٹھائی بھی تقسیم کروا رہے ہیں اور انھوں نے ایک اور بڑا اچھا کام کیا ہے اور وہ یہ کہ ہردیال سنگھ کا لڑکا جگجیت سنگھ جس کے متعلق آپ نے بھی حکومت سے سفارش کی ہے کہ اُسے تعلیم دلوائی جائے اور پھر اسے پولیس میں ملازمت دلوائی جائے۔ جب یہ بات میں نے میاں صاحب کو بتائی تھی تو انھوں نے فوراً کہا تھا کہ اُس کی تعلیم کا سارا خرچہ میں برداشت کروں گا۔"

عبدالعزیز نے کہا "میں عام حالات میں شاید نہ رکتا لیکن میاں صاحب اگر اُس لڑکے کو اس قدر نیکی کا مستحق سمجھتے ہیں تو میں ان کی دعوت سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن میں کھانا کھاتے ہی چلا جاؤں گا۔"



ڈیڑھ گھنٹہ بعد یہ سب لوگ عبدالکریم کے گھر میں دعوت کھا رہے تھے۔ عبدالکریم نے بیس پچیس ہندو اور سکھ مہمانوں کی دعوت کا انتظام ہردیال سنگھ کے گھر کروا رکھا تھا۔ جب انسپکٹر عبدالعزیز دعوت سے فارغ ہو کر حویلی سے باہر نکلا تو آس پاس کے دیہات کے کئی آدمی اسے سلام کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور جب وہ روانہ ہوا تو عبدالکریم نے چپکے سے ایک طرف ہو کر پانچ روپے کا نوٹ ٹپو کو تھما دیا اور اس کے بعد فضل دین اور ہردیال سنگھ وہاں جمع ہونے والوں میں مٹھائی تقسیم کرنے لگے۔

دس دن بعد صبح نو بجے یوسف کے والدین اپنے بال بچوں سمیت لاہور جانے والی گاڑی پر سوار ہو رہے تھے۔ گھر کا سامان ان کا ملازم ٹرک پر دو گھنٹے پہلے لے جا چکا تھا۔ اسٹیشن پر ان کے اپنے گاؤں اور آس پاس کے دیہات کے کئی لوگ جن میں خواتین بھی تھیں۔ انھیں رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ عورتیں باری باری قدسیہ سے گلے مل کر یہ تاکید کر رہی تھیں۔ "دیکھو آپا جی ہمیں بھول نہ جانا ہر دوسرے تیسرے مہینے پھیرا ضرور رکھنا جب اطلاع ملا کرے گی تو ہم سب آپ کو لینے کے لیے اسٹیشن پر آیا کریں گے" سردار بیلا سنگھ کی بیوی عبدالرحیم سے کہہ رہی تھی۔ "بھائی جی ہماری بہن کو وہاں قید نہ کر دینا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ان کو یہاں بھیج دیا کرنا ورنہ قدسیہ بھابی کی تمام سہیلیوں کو لے کر میں کسی دن لاہور پہنچ جاؤں گی۔"

گاڑی چلنے میں ابھی دس منٹ تھے کہ اسٹیشن پر عبدالکریم، رشیدہ، امینہ اور اُس کا بھائی علی اکبر نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے فضل دین اور ہردیال سنگھ سامان اٹھائے

آرہے تھے۔ عبدالرحیم نے حیران ہو کر پوچھا "میاں صاحب آپ اب کہاں جا رہے ہیں"؟

جی رات اچانک بچوں نے چھٹیوں کے باقی دن امرتسر میں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔ زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ وہ امرتسر تک آپ کے ساتھ جائیں گے۔ رشیدہ تو یہ امید بھی لے کر آئی ہے کہ آپ ایک دن امرتسر رکنے پر رضامند ہو جائیں گے۔"

"یار اس وقت تو ممکن نہیں، پھر کبھی سہی۔"

عبدالکریم کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن گارڈ نے سیٹی بجائی اور امینہ اور اس کی ماں انٹرکلاس کے زنانہ کمپارٹمنٹ کی طرف بھاگیں، جہاں قدسیہ بیگم اور اس کی لڑکی انھیں اشاروں سے بلا رہی تھیں عبدالکریم اور عبدالرحیم یوسف کے ساتھ اس سے پچھلے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئے ——— گاڑی چل پڑی اور قدسیہ جو ہر وقت مسکرانے کے لیے بیتاب رہتی تھی اب خلاف معمول سنجیدہ اور مغموم نظر آرہی تھی۔

امینہ نے پوچھا "خالہ جان کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں بیٹی"۔ قدسیہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے گھر چھوڑتے ہوئے ایک الجھن سی محسوس ہوتی ہے اور گاؤں سے نکلتے وقت مجھے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہ درخت اور کھیت دوبارہ نہ دیکھ سکوں"

رشیدہ بولی "بہن جی! اصل میں آپ سفر کی تیاری میں تھک گئی ہیں۔ ویسے گھر سے نکلتے وقت ایسی باتیں ہر آدمی کے ذہن میں آتی ہیں۔ آپ لیٹ جائیں میں آپ کا سر دباتی ہوں"

"رشیدہ میں بالکل ٹھیک ہوں"

"نہیں بہن لیٹ جاؤ کافی جگہ ہے"

رشیدہ نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا اور خود ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی۔

امرتسر میں عبدالکریم اپنے بال بچوں کے ساتھ اتر گیا لیکن جاتے جاتے اس نے عبدالرحیم اور اس کے بال بچوں کے لیے سوڈا واٹر کے علاوہ چند درجن کیلے اور سیب رکھوا دیے اور گاڑی کی روانگی تک خواتین آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ جب گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی تو قدسیہ اٹھ کر ایک کھڑکی کے سامنے بیٹھ گئی۔ اگلے اسٹیشن پر یوسف نے آکر پوچھا۔

"امی جان آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ امینہ اور اس کی ماں نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

ماں نے جواب دیا "بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن ان لوگوں کو اتنا تکلف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پانی تو خیر ہم نے پینا ہی تھا لیکن وہ کیلے اور سیب بھی زبردستی یہاں رکھوا گئے ہیں اور ماں بیٹی اس بات پر بھی اصرار کرتے تھے کہ ہم کسی دن لاہور سے امرتسر آئیں اور ایک دو دن ان کے گھر میں رہیں۔"

یوسف نے جواب دیا "امی آپ پریشان نہ ہوں لاہور میں ہمیں اور بہت سے کام ہوں گے اتنی دیکھنے والی جگہیں ہوں گی کہ آپ کسی اور شہر کا رخ کرنا پسند نہیں کریں گی"۔ گاڑی نے وسل دی اور یوسف اپنے ڈبے میں چلا گیا۔

——— O ———

اگلے دن یوسف اپنی امی کو لاہور کی تاریخی عمارات دکھا رہا تھا۔ دو دن میں وہ شاہی مسجد، شاہی قلعہ، جہانگیر کا مقبرہ اور چڑیا گھر دیکھ چکے تھے۔ تیسرے دن وہ شالامار باغ کی سیر کر رہے تھے اور کھانا اپنے ساتھ لاتے ہوتے تھے۔ قدسیہ بیگم کو لاہور کی ہر اچھی عمارت میں بھی اپنے بیٹے کی کوئی نہ کوئی خوبی نظر آتی تھی۔

شالامار باغ میں وہ کھانا کھانے کے بعد ایک جگہ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سستا رہے تھے کہ قدسیہ نے اچانک کہا "بیٹے جب میں شیش محل دیکھ رہی تھی تو

مجھے خیال آیا تھا۔ کہ یہاں کبھی شہزادے اور شہزادیاں رہتی ہوں گی۔ بیٹا! لاہور دیکھ کر تم نے
تو یہ کبھی نہیں سوچا کہ اگر تم کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہوتے تو تمہارے والدین تمہارے لیے دنیا
کی سب سے خوب صورت شہزادی تلاش کرتے۔"

یوسف نے زخم خوردہ سا ہو کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا "امی جان یہ آپ کیا کہہ رہی
ہیں۔ اگر آپ کسی جھونپڑی میں ہوتیں تو بھی مجھے کسی کے محل پر رشک نہ آتا" اور اِن الفاظ
کے ساتھ اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

ماں نے مغموم لہجے میں کہا "ارے بیٹا تم آزردہ ہو گئے میں تو مذاق کر رہی تھی لیکن بیٹا
میں یہ دعا ضرور کرتی ہوں کہ میری بہو ایسی ہو جس پر شہزادیاں رشک کریں۔ تم نے ایک دن کہا تھا
کہ کسی دن جالندھر والوں کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کرو گے اور پھر انھیں خط لکھو گے۔
لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ان کا خیال نہیں آیا۔"

"امی جان جب مناسب وقت آئے گا تو میرے لیے ان کا ایڈریس معلوم کرنا کوئی مشکل کام
نہیں ہو گا۔"

"بیٹا مناسب وقت کب آئے گا؟"

"امی جان جب میں اپنی زندگی کی اہم ذمہ داریاں پوری کر لوں گا: میں پہلے اپنی
تعلیم مکمل کروں گا۔ پھر مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ضرورت ہو گی اور اس کے بعد
آپ اطمینان سے شہزادیاں تلاش کر سکیں گی۔"

"بیٹا تمہارے لیے شہزادیاں اپنے گھروں میں بیٹھی نہیں رہیں گی۔ تم کوئی ایسا
طریقہ سوچ سکو گے کہ میری ان کے گھر تک رسائی ہو سکے؟"

"امی جان اگر آپ اِس بات پر خوش ہو سکتی ہیں تو میں بی اے فائنل کے
دوران آپ کو ان کا ایڈریس معلوم کر دوں گا۔ زیادہ بہتر تو یہ ہوتا کہ میں بی اے کا امتحان
پاس کر لیتا تو آپ اس مسئلے کی طرف توجہ دیتیں۔ لیکن چند مہینوں میں میری زندگی کا

ایک اہم پروگرام شروع ہو چکا ہو گا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں
آپ دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ خود مجھے تلاش کر لیں گے۔ سردست آپ صرف
یہ دعا کیا کریں کہ وہ لوگ ہمیں صرف اسی صورت میں ملیں جب کہ ہماری اور ان کی کوئی
بہتری ہو۔"

ماں نے کہا "بیٹا میں نے صرف ایک بچی اور ایک معمر خاتون کے متعلق
تمہارے منہ سے جو باتیں سُنی ہیں اُن سے میں جو کم از کم توقع رکھ سکتی ہوں۔ وہ یہ
ہے کہ اُن کے خاندان کا ہر فرد ایک اچھا انسان ہو گا۔"

"امی جان! جب آپ کسی کو اچھا سمجھیں گی تو میں سوچے سمجھے بغیر اسے اچھا
سمجھنے لگ جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ نے ابھی سے دادی جان کی طرح سوچنا شروع
کر دیا۔ تو مجھے بڑی الجھن ہو گی۔ وقت آنے پر میری ہر بات آپ کی خواہش کے عین
مطابق ہو گی۔"

ماں نے کہا "بیٹا میں تمہیں دادی جان کی طرح پریشان نہیں کروں گی۔ لیکن
نہ جانے کیوں مجھے اِس بات سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ وقت بڑی جلدی گزر جاتا ہے
اور ہمارے سارے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ بیٹا! جب مجھے کبھی اچانک
یہ خیال آتا ہے کہ کسی دن میرا وقت بھی گزر جائے گا تو میں تمہارے متعلق بہت بے چین
ہو جاتی ہوں۔ میں اِس بات سے بھی خوف کھاتی ہوں کہ تم میرے بعد کوئی غلط فیصلہ
قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جاؤ۔"

"امی جان خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آپ کی پسند کے خلاف کوئی
فیصلہ قبول نہیں کر سکتا اور میں اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کیا پسند اور کیا ناپسند کرتی ہیں۔"

"بیٹا مجھے تمہاری عقل پر بھروسہ ہے اور میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے
کہ تم اپنے متعلق کوئی غلط فیصلہ قبول کرنے پر تیار ہو جاؤ گے لیکن میں ایک ماں ہوں نا

اور میرے دل میں بُرے بُرے خیالات آتے رہتے ہیں۔"

یوسف نے کہا" امی جان، میرے متعلق آپ اپنے دل میں بُرے خیالات نہ لایا کریں۔ میں جو کچھ دنیا میں کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی دعاؤں سے برسوں تک ہمت حاصل کرتا رہوں گا۔

امّی جان! مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ سو برس تک میرے لیے دُعا کرنے کے لیے زندہ رہیں گی۔ آپ کے تمام خواب پورے ہوں گے اور میں اپنے مستقبل کے متعلق جو خواب دیکھا کرتا ہوں آپ ان سب کی تعبیریں دیکھیں گی۔"

" بیٹا! تم پھر مجھے دادی کی طرح سوچنے کا طعنہ دو گے لیکن یہ مان لو کہ میرا سب سے پیارا خواب یہی ہے کہ میں ایک بار اپنی ہونے والی بہو کو دیکھ لوں۔"

" امّی جان! آپ صرف یہ دعا کیا کریں کہ وہ جس کا آپ کو انتظار ہے آپ کی بہترین توقعات پوری کر سکے اور ہم سب کے لیے اللہ کی رحمتیں لے کر آئے ابھی یہ فیصلہ نہ کریں کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے، بزرگوں کو ایسے معاملات اپنی دُعاؤں کے بعد اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ چلیں اب دیر ہو رہی ہے۔"



کالج کھلنے کے بعد یوسف کچھ وقت اپنے امتحان کی تیاری کے لیے نکال لیتا تھا۔ لیکن جو وقت وہ پہلے افسانوی ادب کا مطالعہ کرنے پر صرف کیا کرتا تھا وہ اب تحریکِ پاکستان کی نذر ہو رہا تھا۔ وہ اخبارات اور رسائل کے لیے مضامین بھی لکھا کرتا تھا اور کالج کے مباحثوں میں حصّہ بھی لیا کرتا تھا۔ وہ کالج کے سینئر طلبا کے اُس گروہ میں شامل ہو چکا تھا جن کے ذہنوں پر علامہ اقبال کے افکار چھائے ہوتے تھے۔ وہ جس قدر تاریخ پڑھ چکا تھا اسی قدر شدت سے وہ مسلمانوں کے مستقبل کے

لیے ہندوؤں کے جارحانہ عزائم کے خطرات کو محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں واشگاف الفاظ میں یہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کا حصول کسی کی پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں ہے یہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ کانگریس کی گزشتہ چند برس کی تاریخ اُسے ازبر تھی۔ وہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں کانگرسی حکومت کے مظالم کی داستانیں بیان کرتا تو اُسے پڑھنے یا سننے والے ایسا محسوس کرتے کہ پچھلے دنوں کی داستانیں اُن کی آنکھوں کے سامنے دُہرائی جا رہی ہیں

اُس کے والد اخباروں میں اُس کی تحریریں پڑھ کر اور اُن کی تعریف میں لوگوں کی باتیں سُن کر بہت خوش ہوا کرتے تھے لیکن وہ اس بات پر خفا ہو جایا کرتے تھے۔ کہ میرے لڑکے نے آگے بڑھنے کے بہترین مواقع ضائع کر دیے ہیں۔ اب بھی وہ چاہے تو فوج اور پولیس میں اُس کے لیے ترقی کے راستے کھلے ہیں لیکن یہ بات اُس کے ذہن میں نہیں آتی کہ دنیا میں روزی کمانے کے لیے کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے اور جب کبھی یوسف کی موجودگی میں اس قسم کی بحث شروع ہو جاتی تو وہ نرمی سے یہ کہہ کر بحث ختم کر دیتا۔" ابّا جی! اس وقت ہماری پہلی ضرورت پاکستان ہے۔ جب پاکستان بن جائے گا تو مجھے چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی روحانی تسکین حاصل ہو گی۔ لیکن اگر میں ہندو کی غلامی میں رہ کر لاکھوں کما لوں تو بھی خوشحالی کی وہ زندگی میرے لیے موت سے بدتر ہو گی۔ ابّا جی! جب پاکستان بن جائے گا۔ تو میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی سب سے بڑی توقع پوری کر سکوں گا۔"

امتحان سے چند ہفتے قبل ایک اخبار میں" راہ نجات" کے عنوان سے لاہور کے ایک اخبار نے اُس کی تصویر کے ساتھ اس کا ایک طویل مضمون تین قسطوں میں شائع کیا۔

اخبار کے ایڈیٹر نے مضمون نگار کے بارے میں جو تعارفی سطور لکھی تھیں۔ اِن میں اُس کے گاؤں اور خاندان کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ ہونہار

طالبِ علم کشتی رانی، پیراکی اور شاہ سواری میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے ساتھ اُس کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ جب کالج سے فرصت ملتی ہے تو وہ پاکستان کے رضاکاروں کے ساتھ قرب وجوار کے دیہات میں تقریریں کرنے چلا جاتا ہے۔

جس دن مضمون کی آخری قسط شائع ہوئی اُس دن اُس نے اپنی ماں سے کہا "امی جان! مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کی ایک بہت بڑی خواہش جلد پوری ہونے والی ہے۔"

ماں نے کہا "بیٹا میں تمہارے مضمون بار بار پڑھا کرتی ہوں لیکن تم یہاں بھی وہی نالائقی کر گئے جو تم نے گاڑی میں کی تھی۔ یہ پڑھ کر تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ہم لاہور میں کہاں رہتے ہیں۔"

"امّی جان! میرا کالج اس گھر سے زیادہ مشہور ہے۔ اگر کسی نے صرف میرا نام اور اسلامیہ کالج لکھ کر بھی بھیج دیا تو مجھے خط مل جائے گا۔"

ایک دن عبدالکریم اور اُس کی بیوی اُن کے گھر مٹھائی لے کر آئے۔

قدسیہ نے کہا "بہن مٹھائی کا شکریہ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں کس بات کی مبارک باد دینی چاہیے۔"

رشیدہ نے جواب دیا "بہن یہ مٹھائی ہم لاہور میں اپنی نئی کوٹھی کی بنیاد رکھنے کی خوشی میں تقسیم کر رہے ہیں اور اُس کے مکمل ہوتے ہی امرتسر سے یہاں آجائیں گے، جو زمین ہم نے خریدی تھی وہ دو کوٹھیوں کے لیے کافی ہے۔ یہ جو کوٹھی ہم نے بنوانی شروع کی ہے امینہ کی ہوگی اور دوسری اکبر کے لیے بنے گی۔"

"قدسیہ نے کہا "بہن یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے قریب آجائیں گی۔"

رشیدہ نے کہا: "امینہ کے ابّو نے امینہ سے دو وعدے کیے تھے۔ ایک یہ کہ

جب وہ میٹرک کر لے گی تو ہم لاہور میں اپنی نئی کوٹھی میں آجائیں گے اور دوسرا یہ کہ اُس کا انعام ایک نئی کار ہوگی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جب میں اداس ہوا کروں گی تو امینہ سے کہا کروں گی: "بیٹی چلو تمہاری خالہ سے مل آئیں"۔ قدسیہ نے بڑی کوشش کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا "بہن اگر خدا توفیق دے تو ہمیں بچّوں کی ہر اچھی خواہش پوری کرنی چاہیے"۔

"بہن امینہ کو موٹر چلانے کا بے حد شوق ہے۔ اگر امتحان سَر پہ نہ ہوتا تو آج وہ ہماری موٹر چلا کر یہاں لاتی۔ ہمارا نوکر فضل دین کہتا تھا کہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب نے یوسف کو ڈرائیونگ سکھانے کا انتظام گورداسپور میں کر دیا تھا اور وہ یہاں آنے سے پہلے کافی حد تک سیکھ چکے ہیں۔"

"بہن! یوسف ہر کام بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔ آپ نے اسے دریا میں کشتی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُس نے اتنی مہارت پیدا کر لی ہے کہ ملّاح بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔"

رشیدہ نے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن قدسیہ نے اُسے یہ کہہ کر روک لیا "بہن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو کھانے کے وقت رخصت کر دوں۔ جاؤ صغریٰ بیٹھک میں جا کر امینہ کے ابّو سے کہو کہ آپ کو کھانے کے لیے رکنا پڑے گا۔"

باب - ۱۵

گزشتہ چند ہفتوں میں نسرین کئی بار فہمیدہ کو کوئٹہ سے امرتسر تک کے اپنے سفر کے واقعات سُنا چکی تھی۔ فہمیدہ کے لیے یہ ایک ایسی داستان تھی جس کے بار بار دہراتے جانے سے اُس کی دل چسپی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا وہ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہونے کے بعد جب کبھی اچھّے موڈ میں ہوتی تو کہتی۔

"ہاں نسرین سناؤ نا تمہارے یوسف بھائی نے اُس دیو قامت اور بدتمیز ملّاح کو ایک ہی تھپیڑے سے کیسے چت کر دیا تھا؟ اور تمہارے یوسف بھائی نے گاڑی میں اُس خوفناک صورت باگڑی کی کیسے مرمت کی تھی ——— اچھا نسرین یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں وہ سانپ نظر آجاتا جسے تمہارے بھائی جان یوسف نے درخت کے ساتھ لٹکا ہوا دیکھا تھا تو پھر تم کیا کرتیں؟" اور نسرین ان واقعات کو ایک بار پھر دہراتے ہوئے اپنی ذہانت سے اُن کی دل چسپی میں کوئی نہ کوئی نیا اضافہ کر دیتی۔

عام طور پر دونوں بہنیں بالائی منزل کے کشادہ کمرے میں رہا کرتی تھیں۔ فہمیدہ خود بھی محنتی تھی اور نسرین سے بھی محنت کروایا کرتی تھی۔ لیکن رات کے وقت پڑھائی ختم کرنے کے بعد انھیں تفریحی گفتگو کرنے کا موقع ملتا تو اِدھر اُدھر کے واقعات، اخباری یا

ریڈیو کی خبروں کے متعلق مختصر سی گفتگو کے بعد وہ یوسف کا ذکر شروع کر دیتیں۔

ایک دن نسرین نے کہا "آپا جان! ہم نے سکول کا کام کر لیا ہے اور اب چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ اگر آپ کو بھائی جان یوسف کے پسند کی کوئی چیز پڑھنے کا شوق ہو تو وہ آپ کو مل سکتی ہے۔"

"کہاں سے مل سکتی ہے؟"

"آپا جی! بھائی جو تھیلا بھول گئے تھے۔ اُس میں چار کتابیں ہیں۔ جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ کوئی اچھے ناول ہوں گے۔ ایک بڑے سائز کی کاپی پر اُن کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ آپا جان! مَیں آپ سے پوچھتی ہوں کہ ایسی کتاب جو کسی کی امانت ہو، اُس کی اجازت کے بغیر پڑھنا گناہ ہے نا!"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟"

"آپا جی! میں نے ان کا تھیلا کھول کر کاپی کے چند صفحے پڑھے تھے اور پھر مجھے احساس ہوا تھا کہ جب بھائی جان کو یہ معلوم ہوگا کہ میں چوری چھپے ان کی کتاب پڑھتی رہی ہوں تو وہ بہت خفا ہوں گے اور شاید خدا بھی مجھ سے خوش نہ ہو۔"

فہمیدہ پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "نسرین تمہارے بھائی جان اگر اتنے اچھّے ہیں تو انھوں نے کوئی اچھی بات ہی لکھی ہوگی۔ اِس لیے اگر انھوں نے تمہیں پڑھنے سے منع نہیں کیا تھا، تو تم پڑھ سکتی ہو۔"

"آپا جان! بھائی جان کی باتیں سمجھنا مجھے ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ شاید آپ بہتر سمجھ سکیں۔"

"اچھا! نکالو وہ مسوّدہ کہاں ہے؟ مَیں دیکھتی ہوں تمہارے بھائی کو لکھنا بھی آتا ہے کہ نہیں۔"

"آپا جان! ابھی لاتی ہوں۔" نسرین بھاگتی ہوئی عقبی کمرے میں گئی اور وہاں سے

مسودہ نکال کر لے آئی۔

"لیجئے آپا جان"۔ اس نے کہا "میں نے اُن کا تھیلا الماری میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ نے اُن کی یہ کتاب پسند کی تو مجھے امید ہے کہ آپ انگریزی زبان کی چار اور کتابیں بھی پسند کریں گی جو اُن کے تھیلے میں پڑی ہوئی ہیں۔"

فہمیدہ نے مسودہ کھول کر پہلے صفحے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر پورے انہماک سے پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ نسرین اپنی بہن کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ جب آدھ گھنٹہ فہمیدہ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو اُس نے کہا "آپا جان! میں آپ کے لیے گرم دودھ لاتی ہوں۔"

فہمیدہ نے بولنے کی بجائے صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا وہ بھاگتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے دودھ کا گلاس لا کر فہمیدہ کو پیش کیا۔ فہمیدہ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر گلاس پکڑ لیا اور دودھ پینے کے دوران بھی وہ پڑھنے میں مصروف رہی۔ نسرین اُس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ کر اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ جب اُسے نیند آنے لگی تو اُس نے کہا۔

"آپا جان! آپ تھک جائیں گی۔ باقی کل پڑھ لیں"۔ فہمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اِدھر آؤ نسرین"۔ نسرین آگے بڑھی اور اُس نے مسودہ ایک طرف رکھ کر اُسے گود میں بٹھا لیا اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نسرین! تم نے آتے ہی یہ مسودہ مجھے پڑھنے کے لیے کیوں نہ دیا؟"

"آپا جی مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو یہ پسند آئے گا۔"

فہمیدہ نے کہا "تم اگر اس کے چند صفحات پڑھ لیتیں تو اب تک کئی بار پورا مسودہ پڑھ چکی ہوتیں۔ اگر تمہیں نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں شروع کا کچھ حصہ

پڑھ کر سناتی ہوں۔"

نسرین نے اُس کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"آپا جان! خدا کیلئے مجھے ضرور سنائیے"۔ اور فہمیدہ اپنی بہن کو مستقبل کے ایک ناول نگار کی تحریر پڑھ کر سنا رہی تھی:۔



"———— میں اپنے ماضی کے راستوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو مہینوں اور برسوں کی وسعتوں سے آگے میرے پاؤں کے نشان زندگی کے اُس کنارے تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے میرے شعور کی ابتدا ہوتی ہے۔ سپنے اور حقیقتیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس دَور میں ہواؤں کی لرزش سے گاؤں کے اردگرد پھیلے ہوئے درختوں میں جو سرسراہٹ پیدا ہوتی تھی وہ میرے لیے جدا جدا راگنیوں کی حیثیت رکھتی تھی۔

جب ہم رات کے وقت کھیلا کرتے تھے تو میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر یہ سمجھ جایا کرتا تھا کہ میں فلاں درخت کے نیچے یا قریب کھڑا ہوں۔

———— میں نے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوش سنبھالا تھا جسکے شمال مشرق میں بلند برفانی پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ دکھائی دیتا تھا جنوب کی طرف ایک تاریخی نشیب تھا، جہاں برسات کے دنوں میں جھیلیں اور جوہڑ بھر جاتے تو پانی کی چمکتی ہوئی چادر دُور تک پھیل جاتی تھی۔ جب غروب آفتاب کے قریب، سُرخ بدلیاں سورج کے قریب آجاتی تھیں اور اُن کے عکس میں ایک طرف کانگڑہ کی برفانی چوٹیاں سونے اور شنگرف کے انبار دکھائی دیتی تھیں اور دوسری طرف اُن سے پیدا ہونے والی روشنی سطح آب پر منعکس ہو کر ایک دل کش منظر پیش کرتی تھی۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ کبھی بہت قریب آجاتے ہیں اور کبھی بہت دُور دکھائی دیتے ہیں۔

جب برف پگھل جاتی تھی تو ان پہاڑیوں کی شکل کچھ اور دکھائی دیتی تھی اور جب برف پڑتی تھی تو وہ پھر اپنی پہلی صورت پر آنے لگتی تھیں۔ جب گرمیوں میں خوب بارش ہوتی تھی اور پھر یکایک دُھوپ نکل آتی تھی تو سہ پہر کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ پہاڑ بھاگ کر یکایک ہم سے بہت قریب آگئے ہیں۔ ہمیں نئے نئے غار اور نئی نئی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔

جب بارش آنے والی ہوتی تھی، تو بادل عام طور پر مشرق سے مغرب کا رُخ کیا کرتے اور جتنے زیادہ دن اُن کے قافلے سفر کرتے رہتے تھے اتنی ہی زیادہ بارش ہوتی تھی۔ کافی عرصہ تک میں بوڑھے لوگوں کی ان باتوں پر یقین کرتا رہا کہ یہ بادل گھوڑے سے ہاتھی اور اونٹ بن کر پہاڑوں پر جاتے ہیں وہاں پیٹ بھر کر چشموں اور جھیلوں سے ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اور پھر میدانوں میں بارش ہوتی ہے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ یہ بادل واقعی گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا کہ میں ان پر سواری کر کے دُور دُور کے پہاڑوں کی سیر کیا کرتا۔ پھر میں چند سال بڑا ہو کر یہ پڑھا کرتا تھا کہ سمندروں سے پانی کے بخارات اُٹھتے ہیں اور پہاڑوں کی بلندیوں پر بادل بن کر برستے ہیں تو مجھے پرانی باتوں پر ہنسی آیا کرتی تھی اور اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی میں اس بات پر اداس ہو جایا کرتا تھا کہ جس قدر زیادہ مجھے اس دنیا کا علم ہوتا جائے گا اُسی قدر اس کے اَن گنت عجائبات میرے دماغ سے اوجھل ہوتے جائیں گے اور وہ گاؤں جسے میں پوری دنیا سمجھا کرتا تھا کرۂ ارض کا ایک چھوٹا سا نقطہ بن کر رہ جائے گا۔

گاؤں کے جنوب مشرق میں جھیل سے آگے بڑے بڑے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس جھنڈ کے درختوں کو پردیسی درخت کہتے تھے۔ یہ درخت صرف کوئی ایک میل لمبے اور نصف میل چوڑے علاقے پر پھیلے ہوئے تھے اور علاقے میں کسی اور جگہ اس قسم کے درختوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے اپنے پورے ضلع میں اور اس کے آگے دُور دُور تک ان درختوں سے ملتا جلتا کوئی درخت نہ دیکھا تھا۔ ان "پردیسی درختوں" کے متعلق میری طرح

گاؤں کے ہر بچّے نے یہی کہانی سُنی ہوئی تھی کہ رات کے پچھلے پہر ایک عورت اپنی چکی سے آٹا پیس رہی تھی اچانک اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور صبح کے دھندلکے میں اسے بڑے بڑے درخت شمال مشرق سے جنوب کی طرف بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ باہر نکل کر دہائی دینے لگی "لوگو باہر نکل کر دیکھو درخت بھاگ رہے ہیں۔ بہت بڑے بڑے درخت بھاگ رہے ہیں۔ انہیں روکو ورنہ چھوٹے درخت بھی، اُن کے پیچھے چل پڑے تو گاؤں اجڑ جائے گا۔ درختوں نے اُس کی چیخ پکار سُنی تو جس جگہ پہنچے تھے وہیں رُک گئے۔

اس کے بعد لوگوں نے صبح کی روشنی میں گاؤں کے آس پاس ایک نئی قسم کے درخت دیکھے تو انھوں نے چکّی پیسنے والی عورت کی باتوں پر یقین کر لیا کہ وہ درخت پردیس سے بھاگ کر آتے ہیں اور اس دن سے اُن درختوں کو پردیسی درخت کہا جانے لگا۔ ان درختوں کی عمر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا تھا کہ جن لوگوں تک یہ کہانی بچپن میں اُن کے باپ دادا سے پہنچی تھی وہ بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔

علاقے کے ہندو "پردیسی درختوں" کو دیوتا سمجھ کر اُن کی پوجا کے لیے جایا کرتے تھے۔ کسی کو ان درختوں کی شاخ کاٹنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ پردیسی درختوں کے درمیان چار سمتوں سے آ کر راستے ملتے تھے اور دن کے وقت ایک کشادہ راستے پر تانگے بھی وہاں سے گزرتے تھے لیکن شام کے بعد بہت کم لوگ "پردیسی درختوں" کے قریب جانے کی ہمت کرتے تھے۔ اور اوپر سے چکر کاٹ کر نکل جاتے تھے۔ "پردیسی درختوں" کے متعلق ایک بات بہت مشہور تھی کہ آج تک اُن کی صحیح گنتی نہیں ہو سکی۔ اگر انہیں دوبارہ گنا جائے تو تعداد ہمیشہ مختلف ہوتی ہے۔ تین بار گنا جائے تو بھی تعداد مختلف ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ ہمارے ماسٹر جی بچّوں کو لے کر گئے تھے اور ہر درخت کے نیچے ایک ایک بچّہ بٹھا دیا گیا تھا جو تین چار درخت بڑے جھنڈ سے باہر کھڑے تھے، اُن کی علیحدہ گنتی کر لی گئی تھی۔ پھر سکول کے تمام بچّوں کو ایک جگہ جمع کر کے اُن کی گنتی کی گئی۔

اُن کا خیال تھا کہ درختوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ بچّوں کو دو بارہ نمبر دے کر درختوں کی طرف بھیجا گیا تو اتفاق سے ایک برہمن لڑکے کو قے آگئی اور ہندو ماسٹر نے شور مچا دیا بھاگو! دیوتا ناراض ہو گئے ہیں" کچھ لڑکے بھاگ آتے۔ اُدھر مسلمان ماسٹر نے کہا" چلو! آئندہ ہم تارکول لے کر آئیں گے اور ہر درخت کا چھلکا اُتار کر تارکول سے نمبر لگائیں گے پھر میں دیکھوں گا کہ غلطی کیسے ہوتی ہے؟" گاؤں میں یہ بات مشہور ہوئی تو ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ یہ درخت دیوتا ہیں اور دیوتا کا چھلکا اتار کر تارکول لگانا پاپ ہے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

ایک سکھ گیانی نے علاقے کے ہندو اور مسلمان معززین کو جمع کر کے یہ تقریر کی کہ ان درختوں کو نہ کوئی ایسا پھل لگتا ہے جسے انسان یا کوئی پرندہ کھا سکے۔ نہ اس کی لکڑی کسی کام آتی ہے اِس کو دیوتا سمجھنا پرلے درجے کی بے وقوفی ہے۔ اِس لیے انہیں کاٹ کر اِن کی جگہ کوئی اور کام کے درخت لگائے جائیں۔

ہندوؤں کے ایک با اثر رہنما پنڈت ودیا رام نے اُٹھ کر کہا" کوئی مائی کا لال ایسا ہے جو اِن درختوں کو کاٹنے کی جرأت کر سکے؟

مولوی محمد شفیع امام مسجد اُٹھ کر بولا" مَیں تین دن کے اندر اندر یہ تمام منحوس درخت کٹوا دینے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ لیکن میری یہ شرط ہے کہ وہ لوگ جو انہیں دیوتا سمجھتے ہیں۔ وہ اُس کی لکڑی کی تقسیم میں حصّہ نہیں لیں گے۔

اِس مرحلہ پر پنڈت دینا ناتھ پہنچ گیا اور اس نے کہا" لوگو! یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ درخت کہیں بہت دور جا کر غائب نہیں ہو گئے اور اس پوتر دھرتی پر ٹھہر گئے تھے۔ جہاں ہمارے باپ دادوں کے باپ دادے اِن کی سیوا کے لئے موجود تھے۔ ہمارے لیے یہ درخت دیوتا ہیں اور یہ زمین جو کسی کنہیا کی آواز سُن کر انہیں پسند آگئی تھی۔ ان دیوتاؤں کا مندر ہے"

گیانی کرتار سنگھ نے کہا ——" یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ یہ ساری زمین سردار پورن

سنگھ اور سردار منگل سنگھ کی ملکیت ہے ورنہ اگر یہ ٹکڑا تمہاری ملکیت ہوتا تو تم اِن منحوس درختوں کا نشان تک نہ چھوڑتے ——

منحوس کے لفظ پر ہندو جوش میں آگئے اور درخت کاٹنے کا مسئلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

بچپن میں مجھے گھر کے اندر اور باہر اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے کئی سامان موجود تھے۔ مجھ سے بڑی عمر والے مجھے کندھوں پر اُٹھایا کرتے تھے اور چھوٹے بچّوں اور بچیوں کا میرے گرد ہجوم رہتا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے میری بہنوں کی طرح برادری کی دوسری لڑکیاں بھی میرے گرد جمع ہو جایا کرتی تھیں اور مجھ سے کہانی سنانے کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔ مَیں جو کہانی دادی جان سے سنا کرتا تھا وہ معمولی سے ردّ و بدل کے بعد اُنہیں سنا دیا کرتا تھا۔ پھر دادی جان آتیں اور مجھے گود میں اُٹھا کر اپنے بستر پر لے جاتیں۔ جب مجھے نیند آنے لگتی تو وہ مجھے اپنے بستر پر چھوڑ دیتیں۔ امّی دیر تک باورچی خانہ میں مصروف رہتی تھیں اور میں نیم خوابی کی حالت میں اُن کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یہ انتظار بڑا صبر آزما ہوتا تھا لیکن میں یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ مَیں انتظار کر رہا ہوں۔ شاید میرے کان بہت تیز تھے اور مجھے دیکھے بغیر یہ معلوم ہو جایا کرتا تھا کہ وہ وضو کر رہی ہیں —— پھر وہ اپنے گرد چادر لپیٹتی ہوئی آتی تھیں اور مَیں سانس روک کر یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتیں۔ ارے! آج میرا بیٹا میرے پیار کے بغیر ہی سو گیا میں کوئی جواب نہ دیتا۔ وہ جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیتیں اور کہتیں۔ ارے یوسف تم سچ مچ سو رہے ہو۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ تمہاری آنکھیں کھلی ہیں۔ اچھا بیٹا! سو جاؤ۔ میں چراغ کی روشنی میں انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا اور مجھے نیند آجاتی۔ صبح دادا جان مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو مجھے اٹھا کر اپنے بستر پر لے جاتے وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا کر بار بار یہ دعا مانگا کرتے تھے۔" یا اللہ! میرے پوتے کو نیکی اور پاکیزگی دے۔ کبھی کبھی وہ میری دادی

سے کہا کرتے تھے ہاجرہ غور سے دیکھو! یوسف کے ماتھے پر مجھے کوئی روشنی نظر آتی ہے۔
اُن کی یہ بات اُس وقت بھی دہرائی جاتی تھی۔ جب کہ میں بڑا ہو چکا تھا اور وہ اس دنیا سے
رحلت فرما گئے تھے۔

بچپن کی جو بات مجھے خاص طور پر یاد آتی ہے' وہ یہ ہے کہ سردیوں کے پچھلے پہر گھر
کی عورتیں چرخہ لے کر ایک کشادہ کمرے میں بیٹھ جاتیں اور سوت کاتنے کا مقابلہ شروع ہو جایا کرتا
تھا۔ چرخہ کی آواز میں اُن کے میٹھے اور مدھم سے راگ بھی شامل ہوتے تھے۔ میں کبھی بھی یہ نہیں سمجھ
سکا کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ بہرصورت چرخے کی آواز کے ساتھ مل کر یہ راگ جو تاثر پیدا کرتے تھے
وہ میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا۔

رات کے پچھلے پہر جب تاج دین دھنیا روئی دھنکنا شروع کرتا تھا تو سُننے والوں
کے کان اُس کے گھر کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی اچانک میری آنکھ کھلتی تھی تو مجھے دُور
سے اُس پُراسرار جوگی کی دل کش لے بھی سُنائی دیتی تھی جو گاؤں میں ایک طرف سے داخل
ہوتا تھا اور دوسری طرف سے گیت گاتا ہوا نکل جاتا تھا۔

کھیڈن دے دن چار نی مائے ، کھیڈن دے دن چار

اِس جوگی کے بارے میں عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں کہ بھونکنے والے کُتے
جب اُسے دیکھتے ہیں تو بھونکنا بند کر دیتے ہیں۔ لڑکے اُس کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے کہ اُسے
کسی نے نہیں دیکھا' وہ رات کے اندھیرے میں آتا تھا اور اندھیرے میں ہی چلا جاتا تھا۔
ایک دن مجھے بخار تھا چونکہ ملیریا کا موسم تھا۔ اِس لیے ابا جان گھر میں کونین کی بہت
سی گولیاں رکھ چھوڑتے اور میرے متعلق یہ تاکید کر جاتے تھے کہ اگر مجھے بخار ہو جائے تو کسی تاخیر
کے بغیر کونین کھلا دی جائے۔ بخار کے موسم میں یوں بھی ہر ہفتے ایک گولی ضرور کھانی پڑتی تھی۔
ایک دن میں نے بہت ضد کی تو ماں جی نے چچا شیر علی سے کہا، اور وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا
اور کہنے لگا" دیکھو یوسف تم نے کئی بار مجھ سے کہا ہے کہ تم اُس جوگی کو دیکھنا چاہتے ہو، جو

گاتا ہوا آیا کرتا ہے۔
مَیں نے کہا۔" ہاں میں دیکھنا چاہتا ہوں لیکن کہتے ہیں کہ وُہ کسی کو نظر نہیں آتا۔
" دیکھو! یوسف" تمہیں وہ نظر بھی آئے گا اور تمہارے ساتھ باتیں بھی کرے گا اور
پھر تم سارے گاؤں کے لڑکوں پر رعب ڈالا کرو گے کہ وہ تم سے مل کر گیا ہے لیکن میری ایک
شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ تم فوری طور پر یہ گولی منہ میں ڈالو اور پانی کا گھونٹ پی لو۔ بالکل
اِس طرح" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک گولی منہ میں ڈالی اور پانی کے گھونٹ کے ساتھ نگل
گئے۔

مَیں نے کہا" چچا جان! آپ وعدہ کرتے ہیں؟" "ہاں بھئی! میں وعدہ کرتا ہوں"
مَیں نے گولی منہ میں ڈالی اور پانی کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔
"چچا جان! اگر آپ کہیں تو مَیں ایک اور گولی بھی کھا لیتا ہوں"
چچا شیر علی نے کہا۔" اب ایک گلاس دودھ پی لو" میں نے دودھ پی لیا تو چچا نے
کہا" بیٹا ایک گلاس اور پی لو اگر پورا نہیں تو آدھا پی لو۔ زیادہ دودھ پینے سے تمہیں بخار بھی
نہیں ہو گا اور جوگی بھی اچھی طرح نظر آئے گا"
"وہ کیوں چچا جان؟"
" بیٹا وہ اِس لیے کہ تمہاری آنکھوں میں بخار کا اثر نہیں رہے گا اور نظر تیز ہو جائے
گی"

مَیں نے ایک گلاس اور پی لیا اور سو گیا۔
شام کے وقت میرا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے چچا کو خوش کرنے
کے لیے ایک اور گولی کھالی اور دودھ بھی خوب پیا' پھر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج چچا
جان! میرے پاس رہیں گے۔ ورنہ بخار دوبارہ ہو جائے گا۔
رات کے تیسرے پہر میں مزے سے سو رہا تھا۔ چچا شیر علی میرے سرہانے کے پاس آئے

اور کہا "یوسف! اُٹھو اور میرے ساتھ چلو"۔ میں کچھ پوچھے بغیر اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیا۔ گلی میں باہر نکل کر وہ پیپل کے درخت کے نیچے رُک گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دُور سے آواز سنائی دی۔

"کھیڈن دے دن چار نی مائے

کھیڈن دے دن چار!"

گاؤں کے کتے بھونک رہے تھے۔ آواز قریب آتی گئی اور کتوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر چچا شیر علی نے مجھے بازو سے پکڑ کر درخت کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا "یہاں چپکے سے کھڑے رہو"۔ چچا شیر علی خود بھی تنے کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

جوگی کے ہاتھ میں بلم تھا جس کے پھل سے نیچے کپڑے کی دھجیاں لٹک رہی تھیں۔ جب وہ گاتا ہوا قریب سے گزرا تو شیر علی نے ایک ہاتھ سے اُس کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن دبوچ لی اور کہا۔

"ٹھہر جاؤ! ڈرو نہیں! میں شیر علی ہوں"۔

"چودھری شیر علی"۔

"ہاں یار اگر تم سے آج ہی ملنا ضروری نہ ہوتا تو ہم پیغام بھجواتے۔ بات یہ ہے کہ میرا بھتیجا! تمہیں دیکھنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ یوسف آگے آجاؤ! اور جوگی کو اچھی طرح سے دیکھ لو۔ تم اس کے ساتھ ہاتھ بھی ملا سکتے ہو، باتیں بھی کر سکتے ہو۔ یہ میرا دوست ہے"۔ میں نے آگے بڑھ کر جوگی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا "اگر چچا جان نے تمہیں تکلیف دی ہے تو مجھے بہت افسوس ہے"۔

"نہیں جی! تمہارے چچا جان میرے دوست ہیں"۔

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"یہ میں تمہیں اس وقت نہیں بتاؤں گا۔ لیکن جب تم اپنے چچا کی طرح بڑے

ہو جاؤ گے تو تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ چوہدری جی مجھے آپ کے بھتیجے سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اب اگر اجازت ہو تو مجھے یہاں سے بھاگنا چاہیے"۔ "ہاں تم جاؤ!"

وہ کھیڈن دے دن چار نی مائے۔ کھیڈن دے دن چار" گاتا ہوا چل دیا۔ لیکن وہ کتے جو دیر سے بھونک رہے تھے۔ اَب خاموش ہو گئے تھے۔

میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ سخت بیمار ہوا۔ ابا جان گھر پر موجود نہیں تھے۔ مقامی حکیموں اور سنیاسیوں نے یہ طے کیا کہ میرا بخار کم کرنے کے لیے میرا خون کم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لیے میرے جسم پر جونکیں لگا دیں۔

آنکھوں پر پٹی باندھنے تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے جونکیں لگائی جائیں گی لیکن جب پٹی باندھ دی گئی تو کسی نے مجھے مضبوطی سے بازو میں جکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے جونکیں لگانے والوں کی بات چیت سنی تو میرا مدافعانہ شعور اچانک بیدار ہوا اور میں نے اچانک آنکھوں سے پٹی اتار ڈالی۔ اتنی دیر میں چچا شیر علی اچانک بھاگتا ہوا آیا، اور اس نے کہا بھائی جان آ رہے ہیں اور ڈاکٹر کو ساتھ لائے ہیں۔ ایک جونک میرے گھٹنے سے ذرا اوپر چمٹ چکی تھی اُسے چچا نے جلدی سے مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور جونکوں والے کو ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا "یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ جوتے کھاؤ گے"۔

ڈاکٹر نے دو دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ اِس عرصہ میں میرا بخار جسے ڈاکٹر ٹائیفائڈ کہتے تھے اُتر گیا۔ جاتے ہوئے اُس نے تاکید کی کہ مجھے تین دن صرف دودھ اور اس کے بعد بہت ہلکی غذا دی جائے۔

گاؤں کے شمال مشرق میں سائیں بڈھے شاہ کا تکیہ تھا۔ وہاں ایک قبر اپنے دائیں بائیں کی دو عام قبروں سے کوئی تین گنا بڑی تھی اور اُس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہاں سائیں

جمال شاہ دفن ہیں۔ جو بڈھے شاہ کے پردادا تھے اور دوسری قبریں سائیں بڈھے شاہ کے باپ اور دادا کی تھیں لوگ دُور دُور سے جمال شاہ کے لیے چڑھاوے لایا کرتے تھے اور انہیں عام طور پر بڑا سائیں کہا جاتا تھا۔

سائیں بڈھے شاہ اور خوبیوں کے علاوہ ایک اچھا کاشتکار بھی تھا تکیے کے ساتھ اس کی دس کنال زمین میں اتنی سبزی پیدا ہوتی تھی کہ آس پاس کے دیہات کے لوگوں کو شہر جا کر خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بڈھے شاہ کے کھیت کے کریلے اپنے غیر معمولی سائز کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ اُن کے بزرگ بابا جمال شاہ کا عرس جون کے مہینے میں ہوتا تھا جب کہ کریلوں کی بہتات ہوتی تھی۔ اس لیے عقیدت مندوں کو روٹیوں کے ساتھ سرسوں کے تیل میں تلے ہوئے کریلے تقسیم کیے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کسی ملنگ نے بھنگ کے نشے میں اپنی روٹی سے ایک بہت بڑا کریلا اُٹھا کر بلند کرتے ہوئے نعرہ لگایا

ڈم ڈم کریلا   بڈھے شاہ دا میلہ

اور اس کے بعد یہ نعرہ اس میلے کا اہم گانا بن گیا جو خاص کر بچّوں میں بہت مقبول تھا۔

بڈھے شاہ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ لوگوں کو بالخصوص عورتوں کو جنّوں، بھوتوں اور ہر قسم کے آسیب سے نجات دلا سکتے ہیں اور مریض یا مریضہ کو دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے کہ اس پر کس چیز کا سایہ ہے۔ گاؤں کے اندر اُس کا ایک مرید پیراں دتہ چوکیدار تھا اور دوسرا اللہ رکھا موچی تھا جو دُور دُور تک اُن کا پرچار کیا کرتا تھا اور سائیں بڈھے شاہ بھی ان کے حال پر مہربان تھا اور جو نذرانے اُس کی ضرورت سے زائد ہوتے تھے۔ وہ اللہ رکھا اور پیراں دتہ کے گھر بھیج دیے جاتے تھے۔ سائیں جی کے طریقِ علاج کے چشم دید گواہ ہمیشہ اُن کے عقیدت مند ہوتے تھے۔ آسیب کے مریضوں کو جس کوٹھڑی میں لٹایا جاتا تھا۔ اُس کا دروازہ جن یا بدروح نکالتے وقت دوسروں کے لیے بند کر دیا جاتا تھا اور بڈھے شاہ

کے مرید ہی یہ بتا سکتے تھے کہ جن بھوت یا بدروح کیسے جاتی ہے۔

سائیں بڈھے شاہ بانس کا ایک موٹا ڈنڈا اُٹھا لیتا جو اندر سے کھوکھلا ہوتا تھا اور کسی نامعلوم زبان کے الفاظ دہرانے کے بعد ڈنڈا اُٹھا کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا کرتا تھا۔

"او کالے منہ والے میں نے تمہیں پہچان لیا ہے تم کئی بار یہ وعدہ کر چکے ہو ——— کہ آئندہ تم اس علاقے میں کسی کو تنگ نہیں کرو گے۔ اب بھاگ جاؤ، ورنہ جلا کر بھسم کر دوں گا" اور کوئی بدروح مریض کی زبان سے جواب دیتی "میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے بے آرام کرنے والے کون ہو؟"

بڈھے شاہ جوش میں آ جاتا اور ڈنڈا ہوا میں لہراتا ہوا زیادہ بلند آواز میں کوئی منتر پڑھتا اور پھر غصے سے کانپتا ہوا چلاتا "ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ ورنہ ہم تمہیں زمین کے پاتال میں پہنچا دیں گے۔ جہاں سے تمہاری چیخیں بھی سنائی نہیں دیں گی۔ تم تاریکی میں اُن خوفناک سانپوں اور بچھوؤں کو بھی نہیں دیکھ سکو گے جو ہر گھڑی باری باری تمہیں کاٹا کریں گے۔"

اور مریض کے منہ سے سہمی ہوئی آواز نکلتی

"باباجی میری طرف اتنے غصے سے نہ دیکھیے۔ آپ کی سرخ آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ پھر یہاں نہیں آؤں گا۔ بالکل نہیں آؤں گا۔ باباجی مجھے معاف کر دو"

اس کے بعد مریض اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور سائیں نڈھال سا ہو کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کہتا۔

"یار مار ڈالا اس کالے بھوت نے اتنی لڑائی کی ہے کہ میرے جسم میں ہلنے کی طاقت نہیں رہی۔"

عجیب بات یہ تھی کہ جب سائیں بڈھے شاہ غصے میں آ کر جنّوں بھوتوں کو دھمکیاں دیا کرتے تھے تو اُن کی آنکھیں سُرخ ہو جایا کرتی تھیں اور چہرہ اتنا خوفناک کہ صبح و شام

اُن کے پاس رہنے والے مریض بھی ڈر جایا کرتے تھے۔



سائیں بڈھے شاہ کے تکیہ سے کچھ فاصلے پر ایک ہندو جوگی جانکی داس رہتا تھا۔ اُس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ جنوبی ہندوستان سے آیا تھا اور چند سال قبل ایک سکھ کے کھیت میں دھونی رما کر بیٹھ گیا تھا۔ اتفاق سے اِس کھیت کا مالک بیمار تھا۔ جانکی داس نے اُسے اپنی گٹھڑی سے کوئی دوائی نکال کر کھلا دی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ اور جانکی داس ایک بہت بڑے سنیاسی کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ زمیندار نے چند دن اسے اپنی حویلی میں رکھا اور پھر گاؤں کے لوگوں کے تعاون سے اُس کے لیے اسی کھیت میں ایک جھونپڑا تعمیر کر دیا۔ جہاں آ کر وہ ٹھہرا تھا۔ اور باقی کھیت بھی اسے دان کر دیا۔

جانکی داس باتوں میں بڈھے شاہ کے مقابلے میں بہت تیز تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اُس نے گاؤں کے لوگوں کے چندے سے کنواں بھی کھدوا لیا تھا۔

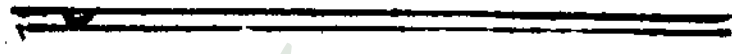
کاروباری رقابت کے باوجود گاؤں کی یہ دو شخصیتیں آپس میں میل ملاپ رکھتی تھیں بڈھے شاہ کا پلڑا اس لیے بھاری تھا کہ اس کا کاروبار برسوں سے چل رہا تھا اور عورتوں میں وہ زیادہ مقبول تھا۔



اللہ رکھا موچی بڈھے کے ایک مستقل مرید کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ دُور دُور دورے پر جایا کرتا تھا۔ اور اُس کا طریق واردات یہ تھا کہ وہ کسی مریض کے بارے میں شبہ پیدا کرتا تھا کہ وہ جن بھوت کے قابو میں ہے اور پھر جب لوگ وہم میں مبتلا ہو جاتے تو انہیں سائیں بڈھے شاہ اور اُن کے بزرگوں کے کارناموں کی حیرت انگیز داستانیں سُناتا۔

گاؤں میں دوسرا مرید پیراں دتہ چوکیدار تھا جو بوقت ضرورت ایسے لوگوں کے پاس

اللہ رکھا کی باتوں کی تصدیق کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور اتنا کامیاب تھا کہ جب وہ کسی سفر سے واپس آتا تھا تو کوئی نہ کوئی اہم مریض بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔



باب ۔ ۱۶

پردیسی درختوں کے ساتھ سکول والے گاؤں میں نعمت علی ایک خاندانی حکیم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھا اور اس کے دیہات میں جب کوئی زیادہ بیمار ہو جاتا تھا تو لوگ علاج کے لیے اسی کی طرف بھاگا کرتے تھے۔

نعمت علی ہمارے گاؤں بھی آیا کرتا تھا اور بڈھے شاہ اور جانکی داس دونوں تکلیف کے وقت اس سے دوائیاں لیا کرتے تھے۔ اِن تینوں میں سے کوئی کسی کا مدّ مقابل یا رقیب نہ تھا۔ وُہ ہنسی خوشی ملا کرتے تھے اور اگر ان کے دل میں کوئی بات ہوتی تھی تو وہ ظاہر نہیں کرتے تھے۔ لیکن دریائے بیاس کے پار کسی گاؤں سے ایک نیا طالع آزما حکیم حسین بخش نمودار ہوا اور اُس نے علاقے کے لوگوں کی پرسکون زندگی تہ و بالا کر دی۔

کہتے ہیں کہ حسین بخش پردیسی درختوں سے کچھ دُور جنوب کی طرف اپنے ایک شاگرد کے ساتھ ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ایک حویلی کے سامنے اُس کی ملاقات گاؤں کے نمبردار سے ہو گئی۔ نمبردار پریشانی کی حالت میں ایک آدمی سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو دلیپ سنگھ تم دیر نہ کرو۔ فوراً جاؤ اور حکیم نعمت علی کو یہاں بھیج دو۔ اُسے کہہ دینا کہ تمہاری بھابی کو بہت تکلیف ہے اور فوراً یہاں پہنچے۔ تم یہ گھوڑی اُس کے حوالے کر دینا اور پھر اگلے گاؤں میں سائیں بُڈھے شاہ اور جانکی داس کو بھی کہہ دینا کہ وہ یہاں آ جائیں۔"

حسین بخش وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا اور اُس نے اپنے ہوشیار شاگرد کو اشارہ کیا۔

شاگرد نے آگے بڑھ کر نمبردار سے پُوچھا۔

"سردار جی حکیم صاحب پوچھتے ہیں کہ آپ کے گھر میں کیا تکلیف ہے؟"

"کون حکیم صاحب؟" نمبردار نے حسین بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

شاگرد نے جواب دیا "سردار جی آپ حکیم حسین بخش کو نہیں جانتے؟ ان کی شہرت تو بیاس سے لے کر راوی تک گاؤں گاؤں پہنچ چکی ہے اور اُدھر بیاس کے پار جالندھر اور ہوشیار پور کے مریضوں کا ان کے پاس تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ ایک قیمتی بُوٹی کی تلاش میں نکلے تھے اور اتفاق سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں قدرت کا بھید ہے۔"

نمبردار نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "حکیم جی قیمتی بُوٹی بعد میں تلاش کر لینا۔ بھگوان کے لیے پہلے میری بیوی کو بچاؤ۔ اس کے دو بچے پہلے ضائع ہو گئے تھے۔ اگر آپ نے میرے تیسرے بچے کو بچا لیا تو عمر بھر آپ کی سیوا کروں گا۔ ورنہ میری بیوی مَر جائے گی۔"

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو اللہ رکھا موچی جو پچھلے گاؤں میں جوتے فروخت کرنے کے بعد واپس جا رہا تھا۔ وہاں سے گزرا۔ وہ سائیں بڈھے شاہ کی سفارش کرنا چاہتا تھا لیکن حکیم حسین بخش اور اُس کا شاگرد نمبردار کے ساتھ حویلی کے اندر چلے گئے۔

اللہ رکھا کچھ تو نمبردار کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے اور کچھ ایک نئے حکیم کے ساتھ دلچسپی کے باعث وہاں سے تھوڑی دُور ایک تیلی دوست کے گھر چلا گیا۔

تیلی نے اُسے کھانے کے لیے روک لیا اور اس کی بیوی نے نمبردار کے گھر کسی نئے حکیم کی آمد کے متعلق سُن کر کہا۔ "بھائی اللہ رکھا کو اُس بیچاری پر بہت ترس آتا ہے لیکن حکیم خواہ کوئی ہو اس کے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ وہ پہلے ہی دو مرتبہ ضائع ہو جانے والے بچوں کے غم میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی ہے۔"

جس وقت تیلی کے گھر میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ نمبردار کے گھر میں حکیم حسین بخش ایک تڑپتی ہوئی عورت کی نبض دیکھ رہے تھے اور چند منٹ بعد مریضہ نے دودھ کے ساتھ اُن کی دوائی کھا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

نمبردار چلایا "حکیم جی کہیں یہ مر تو نہیں گئی؟"

حسین بخش نے اطمینان سے جواب دیا "میری دوائی کھانے کے بعد یہ مر نہیں سکتی۔ اگر گاؤں میں کوئی دائی ہے تو اُسے بُلا بھیجیے۔ مَیں باہر درخت کی چھاؤں میں لیٹ جاتا ہوں۔"

ایک گھنٹہ بعد جب حکیم نعمت علی گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا تو اُس نے حویلی کا دروازہ بند پایا۔ جب شور مچایا تو اندر سے نمبردار کی گرجتی ہوئی آواز آئی۔ "بھئی شور نہ مچاؤ۔ حکیم صاحب کا حکم ہے کہ کوئی اندر نہ آئے۔"

"نمبردار جی! میں حکیم نعمت علی ہوں"۔ دروازہ کھٹکھٹانے والے نے فریاد کی۔

"بھئی مجھے معلوم ہے لیکن تم رہٹ پر چلے جاؤ اور وہاں گھوڑا باندھ دو اور اگر سائیں بڈھے شاہ اور جانکی داس بھی پہنچ جائیں تو انھیں بھی بٹھا لو۔"

"نمبردار جی وہ کس لیے آئیں گے؟"

اندر سے گرجتی ہوئی آواز آئی "وہ اس لیے آئیں گے کہ مَیں اُلّو کا پٹھا ہوں۔"

نعمت علی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "سردار جی خیر تو ہے، بھابی جی کیسی ہیں؟"

"بھابی جی کی فکر نہ کرو۔ ایک بچّہ پیدا ہو چکا ہے اور دوسرا پیدا ہونے والا ہے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ اُس نے میرے گھر ایک فرشتہ بھیج دیا ہے، لیکن تم فکر نہ کرو تم سب کو انعام ملے گا۔"

کچھ دیر بعد حکیم جی اور اُس کا شاگرد نمبردار کے گھر سے پراٹھے کھا رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ مبارک باد دینے آتے تھے تو نمبردار اُنہیں کہتا تھا۔

"پہلے اِس دیوتا کو سلام کرو، جو میرے گھر میں خوشیاں لے کر آیا ہے۔ میں ایک لڑکے سے نا امید تھا۔ بھگوان نے دو دے دیے ہیں۔"



رہٹ پر حکیم نعمت علی، سائیں بڈھے شاہ اور جانکی داس بیٹھے ہوئے تھے اور دبی آواز میں سردار اُدھم سنگھ اور اُس اجنبی حکیم کو گالیاں دے رہے تھے جس کی وجہ سے اُن کی توہین ہو رہی تھی۔

اللہ رکھا جو تیلی کے گھر کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نمبردار کی خیریت پوچھنے کا ارادہ لے کر نکلا تھا کسی سے کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر پھرتا پھراتا رہٹ پر جا نکلا۔ سائیں بڈھے شاہ اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھتے ہی پوچھا "آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ نمبردار اُدھم سنگھ کے گھر کیوں نہیں گئے۔ وہاں آپ کی سخت ضرورت ہے۔" جانکی داس نے کہا "نمبردار بے وقوف ہے اور تم اُس سے زیادہ بے وقوف ہو۔"

"جی میں نے کیا بے وقوفی کی ہے۔ جب وہ ایک نئے حکیم کے سامنے ہاتھ باندھ کر منتیں کر رہا تھا کہ میری بیوی کو بچاؤ تو مجھے خیال آیا تھا کہ میں اپنے سائیں پیر کو بلانے کا مشورہ دوں لیکن وہ نمبردار کے ساتھ اندر چلے گئے تھے اور مجھے موقع ہی نہیں ملا۔"

حکیم نعمت علی نے پُوچھا "لیکن وہ نیا حکیم ہے کون؟"

اللہ رکھا نے جواب دیا "جی مجھے پتہ نہیں۔ لیکن مَیں نے اُس کے شاگرد کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ دریا کے آر پار میلوں سے لوگ اُس سے دوائی لینے آتے ہیں۔"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا "یار ایسے بدمعاش آدمی کے شاگرد لوگوں پر اسی طرح سے رعب ڈالتے ہیں۔"

"لیکن سائیں جی میں نے گلی میں دو عورتوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکا پیدا ہو چکا ہے اور دوسرا ابھی پیدا ہو رہا ہے لیکن آپ جب یہاں آئے تھے

تو آپ کو اندر جا کر دیکھنا تو چاہیے تھا حکیم جی بھلا کوئی ایسی دوائی بھی ہے جس سے اٹھرا کا مرض ٹھیک ہو جائے اور ایک کی بجائے دو بچے پیدا ہو جائیں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ شاید اس بے وقوف حکیم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر اُس کے متعلق یہ مشہور ہو گیا ہے کہ اس کی دوائی کھانے والی عورت ایک کی بجائے دو بچوں کو جنم دیتی ہے تو بیوقوف عورتیں بھی اُس کی دوائی سے کوسوں دور بھاگیں گی۔"

جانکی داس نے کہا۔ "یار میں تو چاہتا ہوں کہ دو کی بجائے تین چار پیدا ہو جائیں اور لوگ اسے لاٹھیاں مار مار کر گاؤں سے نکال دیں۔"

"یار دیکھو شاید نمبردار آ رہا ہے۔" اللہ رکھا نے کہا۔ وہ خاموشی سے گلی کی طرف دیکھنے لگے۔ نمبردار کے ساتھ ایک آدمی گڑ کی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر اسے مبارکباد دی۔ نمبردار نے انہیں گڑ کی دو دو بھیلیاں تقسیم کیں اور پھر تینوں کو پانچ پانچ روپے کا ایک ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھ پر بڑی کرپا کی ہے۔ میں ایک بیٹے کے متعلق فکرمند تھا۔ اب بھگوان نے مجھے دو بیٹے دے دیے ہیں۔ میں آپ کی اور بھی خدمت کروں گا۔"

حکیم نعمت علی نے کہا۔ "سردار جی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔"

نمبردار نے اُن کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا۔ جب اللہ رکھا کی باری آئی تو اُس نے کہا۔ "ارے یار تم اللہ رکھا موچی ہو؟ — شاید میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا تھا۔"

"جی حویلی کے دروازے پر جب آپ حکیم صاحب سے باتیں کر رہے تھے تو میں باہر ہی کھڑا تھا۔ اور پھر اس لیے رُک گیا تھا کہ آپ کے گھر سے کوئی اچھی خبر سُن کر جاؤں۔"

"بھئی میں تم پر بہت خوش ہوں۔ شاید تمہارے درشن کر لینے سے ہی میری مصیبت دُور ہو گئی تھی۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔"

اللہ رکھا نے بڈھے شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سائیں جی مجھے یہاں تیلی کے ساتھ بھی کچھ

کام ہے۔ اگر شام کو نہ آسکا تو کل آؤں گا۔"

وہ تینوں وہاں سے چل پڑے اور اللہ رکھا نمبردار کے ساتھ ہو لیا۔

گاؤں سے نکل کر بڈھے شاہ نے ساتھیوں سے کہا۔ "اُس بیوقوف کو تیلی کے ساتھ کوئی کام نہیں تھا۔ وہ صرف اس نئے حکیم کو اچھی طرح دیکھنے اور اپنی بیوی کے لیے دو لڑکے پیدا کرنے والی دوائی حاصل کرنے کے لیے رُک گیا ہے۔"

حکیم نعمت علی نے کہا۔ "سائیں جی اس گاؤں کے لوگ کافی بے وقوف ہیں۔ اُس چالاک آدمی کا کاروبار خوب چلے گا۔"

جانکی داس نے کہا۔ "یار مجھے تو خود نمبردار سب سے زیادہ بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔"

نعمت علی نے کہا۔ "نہیں یار وہ بیوقوف ہوتا تو ہمیں پانچ پانچ روپے کیوں دیتا۔ کام تو اُس کا ہو گیا تھا اور اب میرا خیال ہے کہ وہ اللہ رکھا کو بھی کچھ دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل کا کھرا ہے اور کسی سے بگاڑ پیدا نہیں کرتا۔"



اللہ رکھا اگلے روز سہ پہر کے وقت سر پر ایک گٹھڑی اُٹھائے اپنے گھر میں داخل ہوا تو بیوی نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ سائیں بابا نے آپ کا دو بار پتہ کیا ہے۔ ابھی ابھی جانکی داس بھی آپ کے متعلق پوچھ کر گیا ہے۔"

اللہ رکھا نے گٹھڑی ایک کھاٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں ٹھہر کر میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ نمبردار نے دو بچوں کی خوشی میں مجھے تین روپے اور دس سیر چاول دیے ہیں لیکن یہ بات کسی کو نہ بتانا کہ وہ حکیم جس نے اُس کی بیوی کا علاج کیا تھا اور جس کے علاج سے دو بچے پیدا ہوئے ہیں۔ اُس نے بھی مجھے ایک روپیہ دیا تھا۔"

"حکیم جی نے تمہیں دیا تھا؟"

"ہاں! میں نے ہاتھ باندھ کر اُس سے کہا تھا۔ کہ میری گھروالی کے لیے بھی کوئی دوائی عنایت کردیں۔ ہماری شادی کو دس سال ہوچکے ہیں اور ابھی تک ہمیں بچے کی خوشی نصیب نہیں ہوئی"۔
حکیم صاحب نے جواب دیا کہ دوائی میں تمہاری بیوی کی نبض دیکھ کر دوں گا۔ میں نے پوچھا کہ حکیم جی نبض دکھانے کے لیے میں اُس کو یہاں لے آؤں گا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں لیکن آپ کو خوش کروں گا"۔ جانتی ہو اُس نے کیا جواب دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا "بھئی ہم غریب آدمیوں سے کچھ نہیں لیا کرتے۔ اُسے یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ مَیں خود کسی دن تمہارے گاؤں آؤں گا۔ پانچ سات دن بعد آؤ اور مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ اگر تمہارے گاؤں میں کسی اور کے اولاد نہ ہوتی ہو یا اٹھرا کا مرض ہو تو اُسے بتا دینا۔ مَیں نے سردار لشمن سنگھ کا بتایا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اُس کی شادی کو پندرہ سال ہوچکے ہیں اور ابھی تک وہ اولاد کے لیے ترس رہا ہے۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ ایسی حالتوں میں کبھی کبھی ہمیں میاں بیوی دونوں کا علاج کرنا پڑتا ہے اور علاج بھی چند دن کے لیے نہیں چند مہینوں کے لیے ہوتا ہے۔ اگر ان لوگوں نے اطمینان سے علاج کروایا۔ تو مجھے یقین ہے کہ ایک سال کے اندر اندر اُن کی خواہش پوری ہوجائے گی ——

مَیں اب بابا سائیں کے پاس جانے سے پہلے سردار لشمن سنگھ کو خوش خبری سنانے جارہا ہوں۔ حکیم کہتا تھا کہ بعض دوائیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ مَیں نے اُسے بتایا تھا کہ سردار لشمن سنگھ کے گھر کسی چیز کی کمی نہیں، وہ سردار ادھم سنگھ سے زیادہ مالدار ہے۔ مَیں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ نمبردار ادھم سنگھ اور گاؤں کے دوسرے زمینداروں نے حکیم صاحب کو وہیں ٹھہرالیا ہے۔ اور چند دن تک گاؤں سے باہر اُس کے لیے ایک مکان بننا شروع ہوجائے گا۔

آج صبح ہوتے ہی سردار اُدھم سنگھ کا سُسر اور سالے وہاں پہنچے تھے اور انہوں نے میرے سامنے حکیم حسین بخش کو پچاس روپے دیے تھے۔ اُدھم سنگھ کے چچا کے بیٹے دلیپ سنگھ نے حکیم کو ایک گائے دی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اگر سائیں جی کی طرف سے کوئی بلانے آئے

تو اُسے کہہ دینا کہ میں بہت جلد اُن کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔ اِن چاولوں اور تین روپے کے متعلق بے شک کہہ دینا لیکن یہ کسی سے نہ کہنا کہ حکیم نے مجھے بھی کچھ دیا ہے"۔
اللہ رکھا لشمن سنگھ سے ملاقات کرکے تکیہ میں پہنچا تو وہاں سائیں بڈھے شاہ کے پاس چند اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے سردار اُدھم سنگھ کے گاؤں میں ایک نئے حکیم کی آمد کا قصہ کچھ اِس انداز سے سنایا کہ شام تک حکیم حسین بخش گاؤں کی ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بن چکا تھا۔
پانچویں دن لشمن سنگھ نے اللہ رکھا کو اپنی گھوڑی دے کر کہا کہ "تم حکیم صاحب کو لے آؤ"۔
تین گھنٹے بعد گاؤں کے لوگ حکیم حسین بخش کا استقبال کررہے تھے۔ اُس نے پہلے اللہ رکھا کے گھر جاکر اُس کی بیوی کی نبض دیکھی اور پھر سردار لشمن سنگھ کی حویلی چلا گیا۔ وہاں اُس نے پہلے سردار جی کی نبض دیکھی اور چند سوالات پوچھ کر اُس کی گھروالی کو دیکھنے چلے گئے۔ پھر رات بھر وہ ان کے مہمان رہے اور صبح جاتے وقت چند دوائیوں کے ساتھ یہ خوش خبری بھی دے گئے کہ "آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگر آپ باقاعدہ دوائی کھاتے رہے۔ تو ایک سال کے اندر اندر آپ کی گود میں ایک خوب صورت بچہ کھیل رہا ہوگا۔ آپ کے لیے چند اور دوائیاں تلاش کرنے کے لیے مجھے لاہور جانا پڑے گا۔ اس لیے دس دن بعد پھر آؤں گا"۔

○

ایک سال کے اندر اندر حسین بخش ایک بہت بڑے حکیم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ جو لوگ اسے ایک حریف سمجھ کر مقابلے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے، اُس کا احترام کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ حسین بخش ایسے لوگوں کو تھپکی دے کر کام لینا جانتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اُس کی ایک بڑی کامیابی یہ تھی کہ سائیں بڈھے شاہ اُس سے علاج کروایا کرتے تھے ——

جانکی داس چند مہینے اُس سے دور رہا لیکن ایک دن وہ بڈھے شاہ کے تکیے میں بیٹھا ہُوا
تھا کہ جانکی داس نے بھی نبض دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

حکیم نعمت علی کو اُس کی وجہ سے کافی نقصان پہنچ چکا تھا لیکن ایک تفصیلی ملاقات کے
بعد اُسے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ یہ شخص بنیادی طور پر جاہل اور طب کے متعلق کچھ نہیں جانتا
اِس لیے وہ اس اطمینان کے ساتھ اُس سے الگ تھلگ رہتا تھا کہ کسی دن ضرور کوئی ایسی
حماقت کرے گا کہ لوگ اُس سے متنفر ہو جائیں گے اور اُس کی یہ امید اگلے سال پوری ہو گئی۔

پہلا واقعہ یہ تھا کہ سردار ادھم سنگھ نمبردار کا چچا زاد دلیپ سنگھ جس نے اُس
کے گھر دو لڑکوں کی پیدائش کی خوشی میں حکیم حسین بخش کو گائے کا نذرانہ دیا تھا۔ اچانک
بیمار ہو گیا۔ حسین بخش نے تین دن تک چند دوائیں آزمائیں لیکن جب اس کا بخار بڑھ
گیا تو رات کے وقت اُس کی فصد کھول دی اور اس وقت تک اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ
کر بیٹھا رہا۔ جب تک کہ اس کے جسم کی تپش دور نہیں ہو چکی تھی اور جب یہ تپش دُور ہو گئی تو
پتہ چلا کہ دلیپ سنگھ کے دل کی حرکت بھی بند ہو چکی ہے۔ شاگرد ہوشیار تھا وہ خون والی
بالٹی اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گیا اور حسین بخش دو گھنٹے یہی ظاہر کرتا رہا کہ مریض کو بخار اترنے
میں نیند آ گئی ہے۔

عام حالات میں ادھم سنگھ کے گاؤں میں یہ رات اُس کی آخری رات ہوتی لیکن اُس نے
یہ احتیاط کی تھی کہ فصد کھولنے سے پہلے دروازہ بند کر لیا تھا۔ ہوشیار شاگرد خون والی بالٹی ریت
سے اتنی صاف کر کے لایا تھا کہ وہ چمک رہی تھی۔ جب گھر والوں کو دلیپ سنگھ کی موت کا علم
ہوا تو حسین بخش اُن سے زیادہ دھاڑیں مار رہا تھا۔ اُدھم سنگھ بھاگا ہوا آیا تو اُس نے
اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ سردار جی جس کا وقت آ چکا ہو اُسے کوئی دوائی نہیں بچا سکتی۔
کاش میں جان دے کر اس خوب صورت نوجوان کو بچا سکتا۔ سردار جی میں نے بہت جتن کیے
تھے لیکن انسان تقدیر کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔

یہ میرے خاندان کی بدقسمتی تھی کہ اتنا بڑا واقعہ دب گیا۔ حکیم نعمت علی نے لاش دیکھ کر
جو شبہات ظاہر کیے اُن پر کسی نے توجہ نہ دی اور حکیم حسین بخش کی شہرت میں کوئی کمی نہ آئی
اُن کے شاگرد عطا محمد نے ایک دن اللہ رکھا کو یہ کہہ دیا کہ اگر ملک الموت سے پانچ منٹ
پہلے بھی حکیم حسین بخش کسی کے گھر پہنچ جائیں تو مریض کی جان بچ سکتی ہے۔ اللہ رکھا کو یہ بات
پسند آ گئی۔ اور جب بھی وہ حکیم کا ذکر کرتا تھا تو یہ فقرہ ضرور دہراتا تھا۔ چنانچہ یہ بات
اتنی عام ہو گئی تھی کہ جہاں لوگ موت کے فرشتے کا ذکر کرتے تھے وہاں حسین بخش کا ذکر
بھی ضرور آتا تھا۔

ہمارے گاؤں کے مولوی صاحب نے بڑے غصے میں آ کر یہ اعلان کیا تھا کہ ایسی
بات کہنا کفر ہے اور سائیں بڈھے شاہ نے بھی اللہ رکھا کی سرزنش کی تھی لیکن ایسی
باتوں سے لوگوں کے اعتقاد میں کوئی فرق نہ آیا۔



چچا شیر علی جو تئیس سال کی عمر میں دور دور تک اپنی جسمانی قوت کا لوہا منوا چکے
تھے۔ ان کی ایک خوب صورت گھوڑی اچانک غائب ہو گئی تھی۔ ہمارے علاقے میں رسہ گیر
چوری کا مال عام طور پر دریا کے پار پہنچا دیا کرتے تھے اور پھر اس کا کہیں پتہ نہیں ملتا تھا۔

چچا شیر علی نے گھوڑی کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا اور اُس کا سراغ لگاتے
ہوئے دریائے بیاس کے پار پہنچ گئے۔ وہاں ہمارے خاندان کے کچھ لوگ آباد تھے۔
انہوں نے چچا شیر علی کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔

بیس دن بعد واپس آئے تو میں نے گاؤں سے باہر لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوتے
انہیں دور سے دیکھ لیا۔ میں پوری رفتار سے ان کی طرف بھاگا۔ چچا کے ایک ہاتھ میں
چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ میں اُن سے لپٹ گیا تو انہوں نے میرا بازو پکڑ کر اٹھایا اور مجھے

اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے۔ تو جو بھی چچا شیر علی کو دیکھتا تھا اس قسم کے سوالات پوچھتا تھا۔

"شیر علی تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ـــ تم اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو؟ ـــ یار تم تو پہچانے بھی نہیں جاتے۔"

میں ایسے سوالات پر حیران ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھے کسی حالت میں بھی چچا شیر علی کمزور نظر نہیں آسکتے تھے۔ میں نے اپنے دل میں اُس وقت ایک دھچکا محسوس کیا۔ جب چچا جی مجھے کندھے سے اتارتے ہی کھلے صحن میں ایک کھاٹ پر لیٹ گئے تھے۔

"چچا جی میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں؟" میں نے پُوچھا۔ انہوں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر میرا بازو پکڑ لیا، اور اپنے ساتھ لٹا لیا۔ دادی اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر چلّا اُٹھیں۔

"بیٹا تم تو بخار میں جل رہے ہو۔"

تھوڑی دیر میں گھر کی خواتین وہاں جمع ہو گئیں۔ میں نے چچا کی کھاٹ سے اُٹھ کر امی جان سے پُوچھا۔

"چچا کو کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹا وہ ٹھیک ہو جائیں گے، تم باہر جا کر اپنے دادا سے کہو کہ وہ کسی کو حکیم کی طرف بھیج دیں۔"

میں نے دادا جی کو باغ میں تلاش کیا اور انہوں نے ایک آدمی حکیم نعمت علی کی طرف بھگا دیا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس وقت حکیم حسین بخش گاؤں میں کسی مریض کو دیکھنے آیا ہوا تھا، اور چچا کے بیمار ہو کر کئی دنوں کے بعد گھر آنے کی اطلاع گاؤں میں پھیل گئی تھی۔

اللہ رکھا بھاگتا ہوا پہلے چچا حیدر علی کے پاس پہنچا پھر میرے پردادا کے پاس

گیا۔ جو ایک سو دس سال کی عمر میں نظر کمزور ہو جانے کے باعث عام طور پہ باہر کی حویلی میں اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے تھے۔

دادا جی نے اپنی لاٹھی پکڑ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا شیر بیمار ہے۔ چلو مجھے گھر لے چلو۔"

میری ایک چچازاد نے ان کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔

اِتنی دیر میں اللہ رکھا گھر پہنچ کر میری دادی سے فریاد کر رہا تھا۔

"ماں جی شیر علی بخار سے بے ہوش ہو رہا ہے۔ حکیم حسین بخش یہاں آئے ہوئے ہیں وُہ جس کی نبض پہ ہاتھ رکھتے ہیں وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر باباجی اجازت دیں تو میں انہیں بُلا لاتا ہوں۔ آپ کو ایسا حکیم کوسوں دُور جا کر بھی نہیں ملے گا۔"

میری چچی نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شیر علی کو بہت بخار ہے، اور اُس کا باپ اُس کا دشمن نہیں ہے، تم حکیم کو بُلا لاؤ۔"

اِتنی دیر میں میرے پردادا بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے کہا۔

"اللہ رکھا تم بہت بے وقوف ہو۔ اگر حکیم گاؤں میں آیا ہوا تھا تو تمہیں اُسے ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔"

اللہ رکھا بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد حکیم حسین بخش اپنے شاگرد عطا محمد کے ساتھ وہاں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے چچا کی نبض دیکھتے ہی دوائی کی پڑیا نکال کر دودھ کے ساتھ کھلائی اور یہ مشورہ دیا کہ مریض کو کمرے کے اندر لٹا دیا جائے۔

حکیم کے مشورہ پر عمل کیا گیا اور چچا کو کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا گیا۔ حکیم دوبارہ نبض پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا لیکن چچا جان کسی تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ دادی نے چچا کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"حکیم جی اس کے پاؤں جل رہے ہیں۔"

حکیم حسین بخش نے کہا۔ "ماں جی اِن کا سارا جسم جل رہا ہے۔ بیماری کے ساتھ جوانی کے خون کی تپش کے باعث ان کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ مَیں ایک اور دوائی دیتا ہوں۔ اگر اِس کا اثر نہ ہوا تو ہمیں کچھ خون کم کرنا پڑے گا۔"

حکیم صاحب کی دوسری پڑیا کا بھی کوئی اثر نہ ہُوا۔ اور حسین بخش نے چچا حیدر علی دادی جان اور دادا جان کے سوا سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی خوفناک بات ہونے والی ہے اور میں چچا کے پاس رہنا چاہتا تھا لیکن امّی جان مجھے بازو سے پکڑ کر باہر میرے پردادا کے پاس لے گئیں جو اب اُسی کھاٹ پر لیٹے ہوتے تھے جس پر تھوڑی دیر پہلے چچا شیر علی لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"یوسف اللہ سے دُعا کرو کہ تمہارا چچا ٹھیک ہو جائے۔ کہو یا اللہ میرے پیارے چچا کو صحت دے۔"

اور مَیں یہ فقرہ بار بار دہرا رہا تھا۔

میں نمازِ مغرب کی اذان سُن کر مسجد چلا گیا تو وہاں نمازی بھی چچا شیر علی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نماز کے بعد گھر آیا تو حکیم نعمت علی وہاں پہنچ چکا تھا اور دادا جان کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے لیے مریض کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اُس نے خود بھی کہہ دیا تھا کہ ایک طبیب کو دوسرے طبیب کے کام میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ لیکن جب اندر سے دادی کی آواز سنائی دی۔

"حکیم جی میرے بچّے کا بہت خون نکل چکا ہے۔ خدا کے لیے اِس کو بند کرو لیکن شاید اب یہ بند بھی نہیں ہو گا۔ اگر میرے بچّے کو کچھ ہو گیا تو تم زندہ اِس گھر سے نہیں نکلو گے۔"

حکیم کہہ رہا تھا "ماں جی آپ حوصلے سے کام لیں اب ذرا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر

دیکھیں۔ آپ کے بیٹے کا بخار اتر گیا ہے۔ تھوڑا سا خون ضائع ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

نعمت علی چلاّیا۔

"خدا کے لیے بند کرا دو اور مجھے دیکھنے دو۔ ماں جی دروازہ کھلوائیے۔"

اندر سے دروازہ کھلا حکیم اور اس کا شاگرد زخمی کلائی پر پٹّی باندھ رہے تھے جس پر رِستے ہوئے خون کا نشان نظر آ رہا تھا۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے لیکن حکیم نعمت علی نے نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد چچا کی آنکھ کھول کر دیکھی تو چلاّ اُٹھا۔

"بھئی اب سب دعا کرو۔ حسین بخش تم یہ خون نکالنے کے بعد اب کون سی دوائی دو گے؟"

حکیم حسین بخش نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"آپ ان لوگوں کو پریشان نہ کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب مَیں صرف تین پُڑیاں دُوں گا اور پھر آپ کے سامنے مریض اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔"

حکیم نعمت علی چلاّیا۔ "خدا تمہیں غرق کرے۔ اب تم کون سی دوائی دینا چاہتے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ شیر علی بابا رحمت اللہ کا پوتا ہے اور عبدالرحیم کا بھائی ہے جو تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دے گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ شیر علی کے ایک ایک بال کے لیے تم جیسے دس حکیم قربان کیے جا سکتے ہیں۔ ظالم کے بچّے میں دلیپ سنگھ کی لاش دیکھنے لگا تھا کہ تمہارے شاگرد نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا تھا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کسی نے اُس کا خون نچوڑ لیا ہے۔"

پھر حکیم نعمت علی باہر نکلا اور میرے پردادا سے مخاطب ہوا۔

"بابا جی! آپ کسی لڑکے کو کہیں کہ وہ گھوڑے پر جائے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔"

○

یہ رات ہمارے لیے قیامت کی رات تھی۔ حکیم حسین بخش کی پُڑیوں کا کوئی اثر نہ

ہوا تھا۔

حکیم نعمت علی سے دادا جان، دادی جان اور چچا غلام نبی نے اصرار سے کہا کہ وہ کوئی دوائی دیں اور حکیم حسین بخش نے بھی دبی زبان میں کہہ دیا۔

"حکیم جی ہمارا مقصد اس نوجوان کی جان بچانا ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی بہتر دوائی ہو تو آپ فوراً دے دیں۔"

حکیم نعمت علی نے کہا "میں اپنے ساتھ ایک معجون لایا ہوں۔ خدا کرے کہ اُس سے کوئی فائدہ ہو جاتے۔"

دادا جان نے کہا "حکیم صاحب جلدی سے وہ معجون نکالو میں اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہوں۔"

جب دادا جان انھیں معجون کھلا رہے تھے۔ تو میں چچا کے بستر کے پاس پہنچ گیا۔ اور ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں رہے۔ میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چچا جان میں یوسف ہوں۔"

اُنھوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یوسف بیٹا جیتے رہو۔ خدا تمہیں بڑی عمر دے اور بھائی جان تمہاری تمام خوشیاں دیکھیں۔"

میں رو پڑا تو دادی جان مجھے پکڑ کر باہر لے گئیں۔ دادا جان نے چچا جان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا شیر علی آنکھیں کھولو۔ تمہاری تکلیف اب کچھ کم ہوئی ہے یا نہیں۔"

چچا جان نے آنکھیں کھولیں۔ اپنا ہاتھ ذرا بلند کیا پھر وہ آنکھیں جن کے اندر میں نے زندگی کی روشنی، توانائی اور اَن گنت شفقتیں دیکھی تھیں، کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُن کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آ گیا۔ گھر کے بچے اور بوڑھے کلمہ پڑھ رہے تھے۔

میں خوف زدہ ہو کر پردادا جی کے پاس آ گیا تھا! وہ میری سسکیاں سن کر کہہ رہے تھے۔

"یوسف شیر علی تم سے بہت پیار کرتا تھا نا؟"

"جی باباجی"

"اگر تم روئے تو انہیں تکلیف ہو گی نا"

میں نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "باباجی میں اب نہیں روؤں گا۔ میں انہیں تکلیف نہیں دوں گا۔"

صبح کے چار بج چکے تھے جس سوار کو ڈاکٹر کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ایک ہی نظر میں سب کچھ دیکھ لیا اور خون سے بھرے ہوئے برتن پر نگاہ ڈالتے ہی دادا جان سے کہا۔

"میاں جی ہم کسی مرض کے لیے دوائی دے سکتے ہیں لیکن قاتلوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتے۔ جس نے یہ خون نکالا ہے وہ قاتل ہے۔ مجھے دکھاؤ وہ کون ہے۔" اور جب قاتل اور اُس کے شاگرد کی تلاش شروع ہوئی تو وہ دونوں کہیں غائب ہو چکے تھے اور پھر میلوں تک ان کا کوئی سراغ نہ ملا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب گھر کا ہر فرد ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا تو انہیں باہر نکلنے کا موقع مل گیا تھا، اور وہ بھاگ کر اُدھم سنگھ کے گاؤں پہنچ گئے تھے اور اُدھم سنگھ نے انہیں فرار ہونے کے لیے ایک گھوڑی دے دی تھی۔ پھر ایک مُدت تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔

میرے پردادا شیر علی کے جنازے میں چلتے ہوئے گر پڑے۔ لیکن ہوش آنے پر وہ دو آدمیوں کا سہارا لے کر قبرستان پہنچ گئے تھے۔

اِس علاقے کی تین نسلوں نے اُن کی ہمت اور طاقت کی اَن گنت داستانیں

سُنی تھیں۔ وہ ایک سو دس سال کی عمر تک پہنچنے پر بھی سیدھے چلا کرتے تھے۔ لیکن وُہ چچا شیر علی کی موت کے بعد تین ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔

جب مَیں اُن کا جنازہ پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو دادا جان نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ یہ سمجھا رہے تھے۔

"بیٹا اب دعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ قبرستان ایسی جگہ ہے جہاں کسی نہ کسی دن ہر انسان کو اُٹھا کر لایا جاتا ہے۔ کسی کی فریاد، کسی کے آنسو اور کسی کی چیخیں اس دنیا سے جانے والوں کا راستہ نہیں روک سکتیں۔"

دادا جان کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوتی تھی۔ امی، دادی اور میری چچیاں میرا دل بہلانے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ دادا جان کی نصیحتیں سُن کر مَیں گھر میں کسی کے سامنے نہیں روتا تھا اور اپنے آنسو اور سسکیاں بھی ضبط کر لیا کرتا تھا لیکن گاؤں سے باہر میں چھُپ چھُپ کر چچا شیر علی اور پردادا جان کے لیے رویا کرتا تھا۔

باب - ۱۷

گاؤں میں جنوں، بھُوتوں اور چڑیلوں کی کئی داستانیں مشہور تھیں لیکن ایک قصہ جب پُورے علاقے میں دلچسپی سے سُنا جاتا تھا اور خاصی اہمیت دی جاتی تھی وہ جمعہ شاہ کا تھا۔ جمعہ شاہ کی کہانی جو میں نے متعدد لوگوں کی زبانی سُنی تھی۔ یہ تھی کہ وُہ ایک جن تھا۔ اور ایک مولوی صاحب کے پاس تعلیم حاصل کیا کرتا تھا۔ ایک رات مولوی صاحب نے سبق پڑھانے کے بعد اپنے شاگردوں سے کہا "اب تم سب چلے جاؤ اور چراغ بجھا دو۔ کمرے کے کونے سے جواب آیا۔" بہت اچھا جناب! آپ اطمینان سے سو جائیں۔ میں چراغ بجھا دوں گا۔ پھر تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کہ دُور کونے میں بڑے شاگرد کا بازو بڑھنا شروع ہُوا۔ اور اس کے ہاتھ نے چراغ کے قریب پہنچ کر اُسے گُل کر دیا۔ مولوی صاحب ایک صاحب کرامت انسان تھے۔ انہوں نے کہا "تم ایک جن ہو اور انسان کے بھیس میں مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم ہمیشہ ہماری قید میں رہو گے۔" جن بولا۔

"جناب! اگر آپ مجھے ہر سال آٹھ پہر کے لیے آزاد کر دیا کریں تو میں خوشی سے آپ کی قید قبول کرتا ہوں۔"

بُزرگ نے اُس کی یہ درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ موسم گرما کی بڑی آندھی کو جو

مسلسل آٹھ پہر یا اس سے زیادہ دیر چلتی تھی۔ اسے "جمعہ شاہ" کہا جاتا تھا اور اس جن کی رہائی کا دن سمجھا جاتا تھا جو اس مولوی کی قید میں تھا۔ ویسے آٹھ پہر کی کوئی پابندی نہ تھی۔ جو آندھی بھی زیادہ نقصان کر جاتی۔ لوگ اُسے "جمعہ شاہ" ہی کہہ دیتے تھے۔ گاؤں میں ایک کسان چوہدری محمد رمضان کی تو یہ حالت تھی کہ وہ جونہی مطلع گرد آلود دیکھتا دہائی دینا شروع کر دیتا تھا۔

"بھئی! جمعہ شاہ چلا آ رہا ہے۔"

عام طور پر جمعہ شاہ جون کے آخری اور جولائی کے ابتدائی ایام میں آیا کرتا۔ لیکن ایک دفعہ یوں ہوا کہ۔

مئی کے ابتدائی دن تھے اور محمد رمضان ابھی اپنی گندم کاٹ کر فارغ ہوا تھا کہ آندھی آگئی اور محمد رمضان دہائی دیتا پھرتا تھا "لوگو! جمعہ شاہ کی آزادی کے لیے کوئی دن مقرر نہیں! اسے صرف میرا کھلیان اڑانے کا شوق ہے"۔

فروری میں لوگ پودے لگایا کرتے تھے۔ شہر میں میرے ایک چچا کے دوست کے گھر انگور کی بیل تھی۔ میں اُس کی ایک ٹہنی کٹوا کر لے آیا اور مکان کے صحن کے اندر زمین کھود کر کھاد ڈالی اور وہاں گاڑ دی اور نہایت بے تابی سے اس کی کونپلیں پھوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ امی جان عام طور پر اس کے قریب بیٹھ کر وضو کیا کرتی تھیں جب گرمیاں شروع ہوئیں تو میرے چچا نے بڑھتی ہوئی بیل کو سہارا دینے کے لیے اردگرد ٹہنیاں گاڑ دیں۔ برسات میں بیل بہت پھیل گئی اور چچا نے اُسے سہارا دینے کے لیے لکڑیوں کا ایک چھپر سا بنوا دیا۔ اگلے سال بیل چھپر کو اتنی تیزی سے ڈھانپ رہی تھی کہ اس چھپر کے رقبہ میں اضافہ کرنا پڑا۔

جب پھل کا موسم آیا تو بیل پر سیاہ انگوروں کے گچھے لٹک رہے تھے، ہمارے علاقے کی آب و ہوا ایسی نہیں کہ وہاں اچھا انگور پیدا ہو سکے۔ لیکن امّی جان اِس انگور کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں اور وہ خود کھانے کی بجائے اِسے تقسیم کر کے

زیادہ خوش ہُوا کرتی تھیں اور یہ کہنا کبھی نہیں بھُولتی تھیں "کہ اس میٹھے انگور کا پودا یوسف نے لگایا تھا"۔ تین چار سال کے اندر یہ بیل اتنی پھیل گئی تھی کہ صحن میں دلان کے اس حصّے کے سامنے ایک اچھا خاصا سائبان بن چکا تھا اور گھر کی خواتین کو جب مکان کے اندر حبس محسوس ہوتا تھا تو بیل کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔



ہمارے گاؤں کے ایک باغ میں اچھی قسم کی ناشپاتیاں تھیں جنھیں عبدالمجید باغبان کشمیری ناشپاتیاں کہا کرتا تھا۔

ستمبر میں گاؤں سے پانچ میل دُور ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ عبدالمجید نے اِس میلے میں ناشپاتیاں لے جانے کے لیے چچا غلام نبی سے ایک دن کے لیے اُن کی ایک گھوڑی مانگی تھی۔ چھوٹے قد کی اِس گھوڑی سے سواری کی نسبت باربرداری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور چچا غلام نبی کسی ضرورت مند کو مایوس نہیں کیا کرتے تھے۔ رات کے وقت مکان کی چھت پر اس میلے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ کوئی مداریوں اور کوئی بازی گروں کے حیرت انگیز کرتبوں کا ذکر کر رہا تھا۔ کوئی کشتی لڑنے والے پہلوانوں اور کبڈی کے کھلاڑیوں کے متعلق بتا رہا تھا۔ میری عمر کے چار اور لڑکے بھی وہاں موجود تھے۔ جب بڑی عمر کے آدمیوں نے میلہ دیکھنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بھی تیار ہو گئے۔ مَیں نے کہا مَیں بھی جاؤں گا۔ فوراً دوسرے کونے سے دادا جان کی آواز آئی۔ "یوسف اِدھر آؤ!" مَیں اُن کے پاس چلا گیا "تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" دادا جان نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں اُن کے ساتھ میلہ دیکھنے جاؤں گا۔"

"ذرا قریب آؤ۔" مَیں بلا جھجک اُن کے قریب چلا گیا۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے میرا کان پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے چپت رسید کرتے ہوئے کہا "شرم نہیں آتی تمہیں؟"

چپت بہت ہلکی تھی لیکن یہ دادا جان کی پہلی چپت تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ میری دنیا میں کوئی انقلاب آگیا ہے۔

دادا جان نے کہا "جاؤ سو جاؤ"۔

میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جن لوگوں نے مجھے پہلے جانے پر آمادہ کیا تھا اُن کی مجلس اُسی وقت برخاست ہوگئی تھی۔ جب میں نے دادا جان سے چپت کھائی تھی۔ لیکن میں، دیر تک غم وغصہ کی حالت میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں اپنی چھت سے عبدالمجید کے گھر کے صحن کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ پچھلے پہر مجھے اس گھر میں چند آوازیں سنائی دیں۔ اُٹھ کر دیکھا تو عبدالمجید اُس کا بھائی اور بیٹا گھوڑے پر بورا لاد رہے تھے۔ میں نے جُوتا پہنا اور دبے پاؤں نیچے اُتر آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ڈیوڑھی کے نیم وا دروازے سے گلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے گھوڑی کی آہٹ سنائی دی۔ عبدالمجید کہہ رہا تھا "بیٹا روشن دین۔ اب تم واپس جاکر سو جاؤ۔ اِن ناشپاتیوں کے لیے مجھے تمہیں ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں"۔

جب عبدالمجید لدی ہوئی گھوڑی کی لگام پکڑے آگے نکل گیا تو میں قدرے توقف کے بعد اُس کے پیچھے چل پڑا۔ کوئی ایک گھنٹہ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ جب ہم ایک گاؤں کی مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے تو میں نے آگے بڑھ کر کہا، چچا عبدالمجید ٹھہرو میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔

عبدالمجید نے مُڑ کر دیکھا تو سخت پریشان ہُوا۔

"تم اِس طرف کیا لینے آئے ہو؟"

"میں بھی میلہ دیکھنے جا رہا ہوں"۔

عبدالمجید نے کہا "خدا کے لیے مسجد میں بیٹھے رہو۔ صبح ہوتے ہی واپس چلے جانا۔ ورنہ میری شامت آجائے گی"۔

میں نے جواب دیا "نہیں اب میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ میں یہ کہہ کر مسجد کے اندر چلا گیا۔ میں نے مسجد کے اندر جاکر وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر عبدالمجید کے ساتھ ہو لیا۔

ہم میلے والے گاؤں میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ دکاندار ابھی اپنی دکانیں سجا رہے تھے کہ عبدالمجید نے بیری کے ایک درخت کے ساتھ گھوڑی باندھی۔ پاس ہی ایک چادر بچھائی اور دو آدمیوں کی مدد سے بورا اُتار کر وہاں ڈھیر کر دیا۔ وُہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اُسے اچھی جگہ مل گئی ہے۔ مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور میلے سے میری ساری دلچسپیاں ختم ہوچکی تھیں۔ مجھے اسی عید پر دادا جان نے ایک روپیہ دیا تھا اور یہ نصیحت کی تھی کہ اُسے سنبھال کر رکھنا اور انتہائی ضرورت کے بغیر اسے خرچ نہ کرنا۔ امّی جان نے بھی مجھے دادا جان کا روپیہ سنبھال کر رکھنے کی نصیحت کی تھی۔ میں تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد عبدالمجید کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ جب مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تو میں خالی بورے کے اُوپر لیٹ گیا۔ جب صبح دُھوپ آئی تو میری آنکھ کھلی اور گاؤں کے چند آدمی پاس کھڑے عبدالمجید کو ملامت کر رہے تھے کہ تم اِسے ساتھ کیوں لائے ہو۔ عبدالمجید قسمیں کھا رہا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ اس سے پُوچھ لو کہ مجھے گاؤں سے نکلتے وقت معلوم نہیں ہُوا تھا کہ یہ میرے پیچھے آرہا ہے۔

انہوں نے مجھ سے پُوچھا تو میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ لیکن اس بات سے مجھے بہت پریشانی ہوتی کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی میلے پر نہیں آیا تھا جن کی باتیں سُن کر میں نے دادا جان سے چپت کھائی تھی۔

ہمارے گاؤں کے ایک سکھ ہربنس سنگھ نے کہا "میاں یوسف اُٹھو۔ میلہ چل پھر کر دیکھا جاتا ہے۔ جب گرمی محسوس کرو تو اِس طرف آموں کی چھاؤں بہت ٹھنڈی ہے۔ وہاں حلوائی کی دکان بھی ہے اور سوڈا واٹر بھی ملتا ہے۔ وہاں تمہیں

تازہ پکوڑے بھی ملیں گے۔ گرم گرم پکوڑے کھاؤ اور پھر برف ڈال کر خوب سوڈا پیئو۔ ساری تھکاوٹ دُور ہو جائے گی۔"

مَیں اُٹھ کر وہاں سے آموں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ دو چھابڑی والے پکوڑے بھی بیچ رہے تھے۔ مَیں نے ایک سے ایک آنے کے پکوڑے مانگے اور اُسے ایک روپیہ دے دیا۔ دکاندار نے ایک پیتل کی طشتری سے پیسے نکال کر گننا شروع کر دیے تو مَیں نے کہا "مجھے پیسوں کی بجائے ایک اٹھنّی اور باقی دوانیاں یا آنے دے دو۔" دوکاندار نے غور سے میری طرف دیکھا اور ایک اٹھنّی اور سات آنے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ مَیں نے تمام سکّے غور سے دیکھ کر اپنی جیب میں ڈال لیے اور ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے گرم گرم پکوڑے کھا کر کچھ فاصلے پر ایک شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ پکوڑے بہت لذیذ تھے اور میری ضرورت سے بہت زیادہ تھے۔ ضرورت سے زائد جو بچ گئے تھے وُہ مَیں نے اُسی کاغذ میں لپیٹ لیے۔ کنوئیں پر جا کر پانی پیا اور واپس جا کر باقی پکوڑے عبدالمجید کے آگے رکھ دیے۔ اور اس کے بعد میلہ دیکھنے لگ گیا۔ یہاں میرے لیے پریشانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے لیے دھوپ میں مداریوں اور بازیگروں کے تماشوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ یہ ناشپاتی کا موسم تھا۔ اس لیے کئی جگہوں پر دیسی ناشپاتیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور لوگ دھڑا دھڑ ایک پیسہ فی سیر خرید رہے تھے۔ میرے لیے سب سے پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ عبدالمجید اپنی اعلیٰ قسم کی ناشپاتیاں جنہیں وہ کشمیری ناشپاتیاں کہتا تھا ایک آنے فی سیر سے کم بیچنے پر تیار نہ تھا اور دوپہر تک اس کے ڈھیر کے حجم میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ خریدار آتے تھے اور جھگڑا کر کے چلے جاتے تھے۔ مَیں نے کہا "چچا عبدالمجید خدا کے لیے انہیں بیچو۔ جب میلہ ختم ہو جائے گا تو اِن کا کیا کرو گے؟"

عبدالمجید نے اطمینان سے جواب دیا "میاں جی یہ شہر میں بھی دو تین پیسے سیر بک جاتی

گی۔ مَیں انہیں سستی بیچنے کی بجائے واپس لے جاؤں گا اور کل انہیں شہر میں جا کر بیچوں گا۔"

اِس جواب سے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مَیں نے پانچ میل چلنے کے بعد ہی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہ مجھے دادا جان کی حکم عدولی کی سزا مل رہی ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں گھر پہنچتے ہی سب کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا اور دادا جان سے معافی مانگوں گا۔ پھر میں یہ یقین لے کر آیا تھا کہ واپسی پر مجھے پیدل چلنے کی بجائے سواری کے لیے گھوڑی مل جائے گی۔ مَیں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گھوڑی پر پھر ناشپاتیاں لدی ہوئی ہوں گی اور مجھے پیدل چلنا پڑے گا۔ مَیں نے اپنے گاؤں کے آدمی تلاش کیے اور انہیں سمجھایا کہ مجید چچا غلام نبی کی گھوڑی مار ڈالنے پر تُلا ہوا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ پھر ناشپاتیوں کا بورا اُس پہ لاد دے اور گاؤں لے جائے۔ یہ کتنی بے وقوفی کی بات ہے کہ دوسرے لوگ ایک پیسے سیر بیچ رہے ہیں اور یہ ایک آنہ مانگتا ہے۔ دو پیسے لینے کے لیے بھی تیار نہیں اور چار پانچ آدمی اس کے گرد جمع ہو کر کہہ رہے تھے "یار تم عجیب پاگل ہو۔" اور وہ چلّا رہا تھا "دیکھو جی پاگل میں نہیں ہوں۔ پاگل یہ لوگ ہیں جو دیسی ناشپاتیوں اور کشمیری ناشپاتیوں میں تمیز نہیں کرتے۔"

ایک سکھ نے کہا "بے وقوف یہ گل جائے گی۔"

"گل جائے گی تو میری گل جائے گی تمہیں اس سے کیا؟ یہ بے وقوف لوگ بھی تو مفت نہیں کھائیں گے۔"

عبدالمجید کو سمجھانے والے اپنا سا منہ لے کر پیچھے ہٹ گئے اور اُس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پہلی بار یہ نعرہ لگایا "لے لو کشمیر کی جنت کا پھل تین پیسے سیر۔ ایک بار کھاؤ گے ساری عمر یاد کرو گے اور پھر دیسی ناشپاتی کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ یہ ناشپاتی سیب کی بہن ہے۔"

کچھ گاہک اِس امید پر اس کے گرد جمع ہو گئے کہ شاید یہ اور نیچے آ جائے۔

میں نے محسوس کیا کہ سورج بڑی تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

جب عبدالمجید اپنے گاہکوں کے ساتھ سر کھپا رہا تھا تو میں نے بیری کے پیچھے جا کر اطمینان سے گھوڑی کو لگام دی۔ اس کا رسّہ کھول کر گردن سے لپیٹا اور اُسے بیری سے کچھ فاصلے پر باغ کی طرف لے گیا۔ وہاں ایک درخت سے شاخ توڑی پھر اطمینان سے گھوڑی پر سوار ہو گیا اور اسے ہانکتا ہوا واپس مجید کی طرف لے گیا آٹھ دس قدم کے فاصلے سے میں نے بلند آواز سے کہا۔ "چچا مجید السلام علیکم میں جا رہا ہوں۔"

مجید چلایا "میاں جی، خدا کے لیے ٹھہرو۔ میرا بیڑا غرق نہ کرو۔"

"چچا! اب رات ہونے والی ہے تم میرے ساتھ جانا چاہتے ہو تو جلدی سے کام ختم کرلو۔"

گاؤں کے دو آدمی یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا "یوسف تم جاؤ۔ اس بے وقوف کا علاج یہی ہے۔"

مجید کسی توقف کے بغیر چلایا "جنت کا پھل لُوٹ لو۔ دو دو پیسے۔ دو دو پیسے۔"

اور ہجوم اس پر ٹوٹ پڑا۔ جب یہ ڈھیر بہت چھوٹا سا ہو چکا تھا تو "لے لو۔ لے لو ایک ایک پیسے لے لو" کی آواز سنائی دی اور مجید کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ پیسے کون دیتا ہے اور ناشپاتی کون اُٹھاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اُس کی مدد کر رہے تھے۔

میں اُس کے قریب آگیا تو اُس نے اپنی چادر اُٹھا کر جھاڑتے ہوئے کہا۔ "یار! میں واقعی بے وقوف ہوں۔ یہ بات پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی کہ لوگ دُگنی قیمت تو دے سکتے ہیں۔ چار گنا کبھی نہیں دیتے۔"

میں نے گھوڑی سے اُترتے ہوئے کہا "چچا یہ بورا گھوڑی کی پیٹھ پر ڈال دو۔ میں

تمہیں اپنے پیچھے بٹھا لوں گا۔"

ایک منٹ کے بعد ہم دونوں گھوڑی پر سوار ہو چکے تھے۔ ایک سکھ نے پیچھے سے آواز دی "میاں یوسف کمال کرتے ہو تم بھی۔ اس کی سزا کم از کم یہ تھی کہ یہ بورا سر پر اُٹھا کر گاؤں میں پہنچتا۔"

میں نے جواب دینے کی بجائے گھوڑی کو چھڑی مار دی۔

مجید نے کہا یہ گھوڑی بڑی منحوس ہے۔ اگر میں تھک نہ گیا ہوتا تو پیدل چل کر جلدی گھر پہنچ گیا ہوتا۔"

میں نے جواب دیا "جب جانور بھوکا ہو اور اس کا رُخ گھر کی طرف ہو پھر رات بھی آ رہی ہو تو اس کی رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے۔"

اب گھوڑی مجید کی توقع کے خلاف بہت تیز چل رہی تھی لیکن اس کی چال ایسی تھی کہ ایک میل چلنے کے بعد مجید کے جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں:

"میاں جی۔ ایسا کرو کہ یہاں مجھے اتار دو ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

میں نے اُسے ایڑ لگائی۔ ایک دو چھڑیاں ماریں اور وہ بھاگنے لگی۔

رات ہو چکی تھی اور میں جس راستے آیا تھا مجھے قطعاً یاد نہیں تھا تاہم گھوڑی کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے سیدھا گھر لے جائے گی۔ ایک جگہ گھوڑی نے ایک چھوٹی سی کھائی کے اُوپر سے چھلانگ لگائی اور مجید ایک طرف لڑھک گیا۔ اُس نے میری کمر میں مضبوطی سے ہاتھ ڈال رکھے تھے اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گرنے سے بچایا اور پوری قوت سے گھوڑی کی باگ کھینچ کر اُسے روکا۔ مجید نے چند قدم گھسیٹنے کے بعد مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور ہائے کہہ کر زمین پر گر پڑا۔

"چچا ٹھیک ہو نا؟" میں نے گھوڑی سے کودتے ہوئے پوچھا۔

"میاں جی میں ٹھیک ہوں۔ خدا کی قسم گاؤں میں چودھری غلام نبی بھی یہ بات

نہیں مانے گا کہ جب مجید کی جان پر بنی ہوتی ہو تو اس کی گھوڑی بھی ہرن کی طرح چھلانگیں مار سکتی ہے۔"

میں نے کہا "چچا بیٹھ جاؤ۔ اب ہم آہستہ چلیں گے۔"

"میری توبہ میں اس کے قریب بھی نہیں جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے وہ ناشپاتیاں بکوا دی تھیں ورنہ وہ کسی گڑھے میں پڑی ہوتیں۔ میاں یوسف خدا کے لیے تم جلد سے جلد گھر پہنچو لیکن وہاں یہ نہ کہہ دینا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"

میں جب گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا تو وہاں بچے بوڑھے، مرد اور عورتیں میرا انتظار کر رہے تھے۔ دادا جان مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سیدھا اُن کے پاس پہنچا۔ اور اُن کے قریب دو زانو ہو کر سر جھکاتے ہوئے کہا "دادا جان! میرے منہ پر ایک اور چپت مار دیجئے اور مجھے معاف کر دیجئے۔"

دادا جان نے پیار سے دونوں ہاتھ میرے سر پر رکھ دیے۔ "بیٹا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری چپت سے تمہیں بہت تکلیف ہوئی تھی۔ یہ سراسر میری غلطی تھی، ورنہ تم کبھی گھر سے نہ نکلتے۔ اب میں اپنے خاندان کو یہ نصیحت کر کے جاؤں گا کہ کوئی تمہاری دلآزاری نہ کرے۔ دیکھو مجھ سے زیادہ تمہاری امی اور دادی کو تکلیف ہوئی ہے۔ اُن کے پاس جاؤ میں نفل پڑھ کر گھر آؤں گا۔ اور اگر تم سو نہ گئے تو ہم بہت سی باتیں کریں گے۔"

اُس رات میں دیر تک باتیں کرنے کے بعد دادا جان کے ساتھ ہی سو گیا اور اُس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ اُن کی ایک چپت کھانے کے بعد میں یکایک اُن کے دل سے اتنا قریب ہو گیا یا ہمارے درمیان ایک ایسا رشتہ استوار ہو گیا جو اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ہائی سکول کے ابتدائی دِنوں میں مجھے جن لوگوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اُن میں سے ایک

بہادر سنگھ تھا۔ قد و قامت میں وہ عام آدمیوں کے لگ بھگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ابھی تک چھٹی جماعت میں تھا اور فیل ہونے کی وجہ سے سکول کے معاملات کا کافی تجربہ رکھتا تھا وہ نئے لڑکوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔

مجھے اپنی عمر کے لحاظ سے بلند قامت لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن بہادر سنگھ جو مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑا تھا۔ قد میں چار انچ زیادہ تھا۔ اس کے اُوپر کے دانت ذرا لمبے تھے اور ہنستے ہوئے اتنے نمایاں ہو جاتے تھے کہ اُسے اپنے ہاتھ کی اُنگلی کی مدد سے بار بار اُوپر کا ہونٹ نیچے لانا پڑتا تھا۔ اپنے دانتوں کی بدولت وہ ہر حالت میں مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ اُس نے پرائمری تعلیم کوئی پانچ میل دُور بڑی نہر کے کنارے ایک گاؤں میں حاصل کی تھی۔ اُس کے باپ کی حویلی گاؤں سے کوئی تین فرلانگ باہر تھی۔

سات سال کی عمر تک اُس کی تمام دلچسپیاں اپنے مویشی چرانے اور اُن کی دیکھ بھال کرنے تک محدود تھیں۔ اُس کے گھر میں دو بھینسیں، دو گائیں تھیں۔ جن کے باعث دودھ اور گھی کی کوئی کمی نہ تھی۔ اِس کے باوجود جب اُس نے دوسرے گاؤں کے کسی کسان کے گھر کی خوب صورت بکریاں پسند کیں۔ تو اُس کا باپ دو چار ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد اُسے ساتھ لے گیا اور وہاں سے بکری کے دو بچے خرید لایا۔ اُس کے گھر میں کتوں کا ایک جوڑا بھی تھا۔ جنہیں سارا دن بند رکھا جاتا تھا اور رات کے وقت چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ کتے اتنے خونخوار تھے کہ رات کے وقت کوئی اُن کی حویلی کے قریب سے نہیں گزرتا تھا۔

بہادر سنگھ کے گھر میں ایک گھوڑی تھی۔ جس کی ایک سال کی بچھیری سے اسے بہت پیار تھا۔ جب کبھی وہ حویلی سے باہر نکل جاتی تھی تو بہادر سنگھ کے سوا کوئی اسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں بہادر سنگھ اس بات پر خوش تھا کہ اگلے سال وہ اپنی بچھیری پر سواری کیا کرے گا۔ لیکن ساتویں سال یکایک ایک دِن اُس کے باپ نے یہ فیصلہ سنایا ———— "بیٹا بہادر سنگھ میں نے ماسٹر جی سے بات کر لی ہے۔ تم کل سکول

میں داخل ہو جاؤ گے۔ پنڈت اُوم پرکاش کہتے تھے کہ بہادر سنگھ کے قد کاٹھ کے لڑکے
کو تعلیم حاصل کر کے تھانے دار بننا چاہیے۔ کل میں تمہیں سکول لے جاؤں گا۔ اور پنڈت جی
کے سپرد کر دوں گا۔ کچھ پڑھ لو گے اور ان کا حکم مانو گے تو کسی دن بڑے آدمی بن جاؤ گے۔
ورنہ ساری عمر میری طرح ہل چلاتے رہو گے ——

میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارا گھر گاؤں سے باہر ہے۔ یہاں تمہاری چھوٹی سی
بہن کے سوا تمہارے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سکول میں تم بہت سے بچوں کے
ساتھ خوش رہا کرو گے۔ میں نے زمینداری کے کام کے لیے ایسر عیسائی سے بات
کر لی ہے۔ اُس کو فصل میں سے بیس من دانے دینے پڑیں گے۔ اُس کا لڑکا بھی ہمارے
پاس کام کرے گا۔ اناج کے علاوہ ایک کھیت میں نے اُن کو کاشت کے لیے دینے
کا وعدہ کیا ہے۔"

بہادر سنگھ نے بدحواس ہو کر کہا" باپو میں اپنے گھر رہنا چاہتا ہوں۔ میں
سکول نہیں جانا چاہتا۔ میری بھیڑی کا کیا ہو گا؟ میری بکریاں کہاں جائیں گی؟ اور گائے
کی بچھیا کون سنبھالے گا؟"

"بیٹا جب تم سکول سے چھٹی کے بعد گھر واپس آیا کرو گے تو تمہیں اپنے جانوروں
سے پیار کے لیے کافی وقت مل جایا کرے گا۔ اور ایسر کا لڑکا بھی کافی ہوشیار ہے۔
وہ تمہارے جانوروں کی بہت حفاظت کرے گا۔ تمہاری ماں اور بہن بھی تو تمہارے
جانوروں سے بہت پیار کرتی ہیں —— "بیٹا میں تمہارے فائدے کی سوچ
رہا ہوں —— تم نے کبھی سکول جا کر دیکھا ہے کہ بچے وہاں کتنے خوش
ہوتے ہیں؟"

"پتا جی میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ میں بہت ڈرتا ہوں اور سکول سے دُور رہنا
چاہتا ہوں۔ انسان ایک جگہ بند ہو کر کیسے بیٹھ سکتا ہے؟"

"بیٹا جب سکول میں دل لگ جائے گا تو تم گھر آنے کا نام نہیں لیا کرو گے۔
پنڈت اوم پرکاش بڑا اچھا اُستاد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے دو شاگرد تھانیدار
تین فوج میں جمعدار اور چار پٹواری بن چکے ہیں۔ دس سے زیادہ کارخانے میں کلرک
ہیں۔ بیٹا اگر تم حوالدار بن جاؤ گے تو میں اِس گاؤں میں اپنے آپ کو بادشاہ سمجھوں گا۔ تم نے
اپنے اُستاد کا ہر حکم ماننا ہے' اگر وہ کہے کہ کنوئیں میں چھلانگ لگا دو تو بھی تمہیں یہی سمجھنا
چاہیے کہ تمہارا اس میں ہی فائدہ ہو گا۔ اُداسی تو مجھے بھی بہت ہو گی۔ لیکن زندگی میں ایسی
باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ پرائمری کرنے کے بعد تم ہائی سکول جاؤ گے اور اُس کے بعد
میں نے سنا ہے کہ اُس سے بھی بڑے سکول ہوتے ہیں جنہیں کالج کہا جاتا ہے۔"

بہادر سنگھ نے عاجز آ کر کہا" باپو جی میں تمام عمر پڑھتا ہی رہوں گا؟"

"بیٹا کُل دس سال کی تو بات ہے کہ تم دسویں جماعت پاس کر لو گے۔ اس کے بعد
تمہیں اچھی نوکری مل جائے گی۔ اور اگر تم چار اور جماعتیں پڑھ لو گے تو بڑے صاحب بن
جاؤ گے۔"

——— ○ ———

اگلے دن بہادر سنگھ اپنے باپ کے ساتھ سکول گیا تو ایسر اُن کے ساتھ گھی
کا ایک چھوٹا سا ٹین اُٹھائے ہوئے تھا۔ پنڈت اُوم پرکاش نے بہادر سنگھ کا
قد و قامت دیکھ کر پریشانی کا اظہار کیا۔ لیکن گھی کا ٹین دیکھ کر اُن کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔
بہادر سنگھ کے باپ سورن سنگھ نے پنڈت جی کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"مہاراج بہادر سنگھ میرا بچہ ہے لیکن اِسے انسان بنانا آپ کا کام ہے۔
اور اگر آپ اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالیں تو بھی مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔ میں جانتا
ہوں کہ انسان بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔"

پنڈت جی نے کہا" سردار جی آپ فکر نہ کریں اگر یہ میرا کہا مانتا رہا۔ تو کسی دن بہت

بڑا آدمی بن جائے گا۔"

"جناب جس دن یہ آپ کا کہا نہیں مانے گا تو اُس دن اِس کی مرمت کیا کروں گا۔

کیوں بہادر سنگھ تم یہ وعدہ کرتے ہو کہ پنڈت جی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دو گے۔"

"جی نہیں بالکل نہیں۔"

"اچھا سردار جی اب آپ جائیں اور اِس لڑکے کے متعلق بے فکر رہیں۔"

سورن سنگھ سکول کے اِحاطہ سے باہر نکلا تو اُسے پٹواری دکھائی دیا اور اس کے ساتھ باتوں میں مصرُوف ہوگیا

پٹواری نے پوچھا۔" سردار جی آج آپ اِدھر کیسے آ گئے ہیں؟"

"پٹواری جی آپ سب کہا کرتے تھے کہ بہادر سنگھ کو سکول بھیجو۔ آج مَیں نے آپ کا کہا مان لیا ہے۔"

پٹواری نے کہا۔" بہت اچھا کیا آپ نے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔"

پھر وہ باتیں کرتے ہوئے پاس ہی بڑ کے درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

اُدھر سکول کے اندر بہادر سنگھ کے تعلیمی دَور کا پہلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا ——

پنڈت اُودم پرکاش نے پوچھا۔

"بہادر سنگھ تم بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو؟"

"جی مجھے باپو جی نے حکم دیا تھا۔"

"بھئی میرا مطلب ہے کہ یہاں تم کیا کرو گے؟"

"جی جو آپ کہیں گے۔"

"اچھا اگر میں یہ کہوں کہ بھاگ کر نہر میں چھلانگ لگا دو تو؟"

"جناب اگر آپ یہ کہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں ہر روز نہر میں چھلانگیں لگایا کرتا ہوں۔"

"اچھا بہادر سنگھ تم کان پکڑ کر دکھاؤ۔"

"جی کان پکڑ کر؟"

"ہاں۔"

بہادر سنگھ نے غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھا اور سر نیچے کر لیا اور ہاتھ کی انگلی سے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بے وقوف کس بات پر ہنس رہے ہو! تمہیں معلوم ہے کہ یہاں حکم نہ ماننے کی سزا ملتی ہے۔"

"ہاں جی یہ مجھے پتا جی نے بتایا تھا۔"

"اچھا تو پکڑو کان۔"

بہادر سنگھ نے غور سے پنڈت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔" جناب اسی طرح؟"

"بے وقوف اور کس طرح —— میری طرف اُلو کی طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟"

جناب میرا مطلب ہے کہ اِسی طرح بیٹھے بیٹھے کان پکڑوائیں گے؟

عجیب گدھے ہو تم، تمہارا مطلب ہے میں تمہارے سامنے کھڑا ہو کر ناچوں؟ جلدی کرو۔"

بہادر سنگھ نے اپنی قمیض سے ہاتھ صاف کیئے ایک بار پھر پنڈت کی طرف دیکھا اور پھر اچانک گھٹنوں کے بَل ہو کر پنڈت جی کے دونوں کان پکڑ لیے۔ اُس کی انگلیوں کی گرفت اِتنی مضبوط تھی کہ پنڈت جی کرب کی حالت میں چلّا اُٹھے۔

"بھئی اس پاگل کو ہٹاؤ۔"

" ایک لڑکے نے بھاگ کر اُس کے باپ کو آواز دی۔ پنڈت جی بے بسی کی حالت میں تھے کہ بہادر سنگھ نے کہا۔" ماسٹر جی اگر اجازت ہو تو چھوڑ دوں؟"

پنڈت جی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اُس کا باپ بھاگتا ہوا اندر آیا اور چلّایا۔